قومی زبان

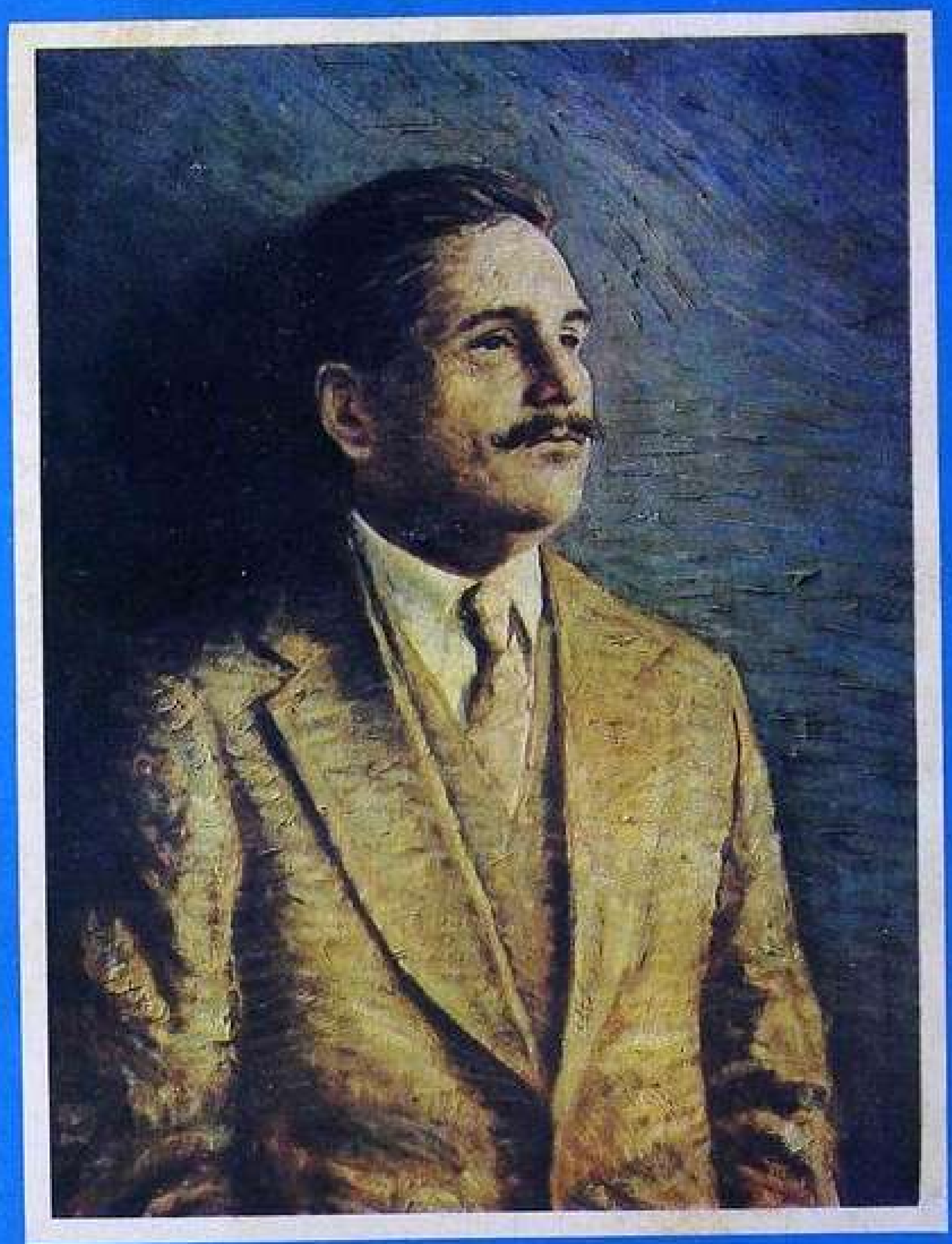

ماہنامہ قومی زبان کراچی

قومی زبان نومبر ۱۹۹۴ء، شمارہ: ۱۱، جلد ۶۶

مضمون نما

اقبال کی نگاہ میں عورت	ڈاکٹر اُم سلمیٰ	۵
اقبال کا ایک نادر خط	شائستہ خاں	۱۷
اردو غزل اور بال جبریل	رفاقت علی سید	۲۵
اقبال کی شاعرانہ عظمت	نیلم سید	۳۱
سر شاہ محمد سلیمان	مختار زمن	۳۵
پیٹر بخسل، جرمن ادب کا طیر آسانی	منیر الدین احمد	۴۱
جدید صنعتی عہد اور اُردو غزل	ن - م - دانش	۵۱
پہاڑ	ڈاکٹر الیاس عشقی	۵۸
گلہائے رنگ رنگ		
خانم نزہت الدولہ	جلال آل احمد / سلیم مظہر	۶۰
سرمایہ الہام (پنجابی)	بابا فرید الدین گنج شکرؒ / ارشد محمود ناشاد	۶۹
دیہاتی (ایرانی)	م - ایمان / معین نظامی	۷۰
رفتار ادب	......	۷۱
کچھ وقت غیر ملکی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۷۶
گرد و پیش	......	۸۰
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۸۸
حروف تازہ	......	۹۴

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مُدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ــــ ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ مُلک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹ - بلاک ۷ - گلشن اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰ - فون: ۴۶۱۴۰۶

اُردو ادب میں انیسویں صدی مرزا غالب کی تھی، اور بیسویں صدی علامہ اقبال سے منسوب ہوئی۔ گویا وہ مرزا غالب کی خالی کی ہوئی جگہ پر فائز ہوئے۔ اکیسویں صدی دستک دے رہی ہے. لیکن اب تک ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اکیسویں صدی میں علامہ کی جگہ لے سکے۔ یہ اُردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ غالب کے انتقال کے فوراً بعد اِسے ایک عظیم شخصیت علامہ اقبال کی صورت میں مل گئی۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ یکے بعد دیگرے عظیم شخصیتیں منظر عام پر آتی ہیں۔ ورنہ دیکھا یہ گیا ہے کہ زبان و ادب میں ایسی عظیم اور قد آور شخصیتوں کے آنے میں سالہا سال کا توقف ہوجاتا ہے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے خود علامہ اقبال نے کہا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اکیسویں صدی کو آنے میں چھے سال رہ گئے ہیں۔ اب یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ کوئی ادبی شخصیت چھے سال کے اندر یا پانچ دس سال اُدھر اک دم سے رقند لگا کر علامہ کی جگہ لینے کو مسندِ ادب پر فائز ہوجائے گی۔ چنانچہ یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی بھی علامہ اقبال کا خیر مقدم کرے گی اور اُن کے کلام اور افکار و خیالات سے اپنے زمانے کے ادب میں روشنی پھیلاتی رہے گی۔ پاکستان کی حد تک تو معاملہ یہ ہے کہ جب تک یہ مملکت خداداد قائم و دائم ہے علامہ اقبال کا کلام اور اُن کے افکار و خیالات ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔

اُردو کے فروغ کے باب میں علامہ اقبال کا یہ قول "گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے": ایک بلیغ اشارہ اِس بات کا ہے کہ اِس زبان کو مزید شانے کی ضرورت ہے۔ یہ وہی کہہ سکتا تھا جس کی نظر میں عالمی زبان و ادب اور اُردو ادب کے ارتقا کی تقابلی صورتیں رہی ہوں۔ علامہ اگر زندہ ہوتے تو انھیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ وہ اُردو "جو منت پذیر شانہ ہے" اُس نے ہر چہار جانب سفر کر کے ترقی کی کتنی ہی منزلیں طے کی ہیں۔ رہا علامہ اقبال کے اِس مصرعے "گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" کی آفاقی اہمیت کا سوال تو وہ تاحال باقی ہے۔ اور ہر دور میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی تاآنکہ ترقی کی کوئی انتہائی منزل نہ آجائے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زبان و ادب کی راہ میں ایسی کوئی منزل نہیں آتی، اُس کے لیے ہنوز روز اوّل ہوتا ہے اور اِسی میں اِس کے تازہ بہ تازہ، نو بہ نو رہنے کا راز مضمر ہے۔

ضروری تصحیح

"قومی زبان" اکتوبر ۹۴ء کے شمارے میں صفحہ ۱۲ کی گیارہویں سطر میں "اقبال کی فکری بلندی کو سمجھے بغیر" کی جگہ "اقبال کی فکری بلندی کو کم کیے بغیر" پڑھیے۔

قومی زبان (۵) نومبر ۱۹۹۴ء

اقبال کی نگاہ میں عورت

ڈاکٹر اُم سلمیٰ
شعبہ اُردو فارسی ڈھاکا یونیورسٹی

علامہ اقبال شاعرِ انسان ہیں اور لفظ "انسان" میں مرد و عورت کی تخصیص نہیں۔ یہ لفظ دونوں جنس پر لاگو ہوتا ہے۔ جہاں اقبال نے "مردِ مومن" اور "مرد کامل" کی مداحی کی ہے وہاں "عورت" کے تصوّر و مقام کو بھی اپنی شاعری و نثر میں نظر انداز نہیں کیا۔ کیونکہ معاشرہ مرد اور عورت دونوں سے تشکیل پاتا ہے۔

۱۹۰۴ء میں مخزن (لاہور) میں "قومی زندگی" کے نام سے اقبال کا ایک مضمون شائع ہوا اس میں نسوانی مسئلوں کے ضمن میں کہتے ہیں: (۱)

"عمومیات کو چھوڑ کر اگر خصوصیات پر نظر کی جائے تو عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمام تمدّن کی جڑ ہے۔ "ماں" اور "بیوی" دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدّنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں۔ اگر ماں کی محبت میں حب وطن اور حبِ قوم پوشیدہ ہے جس میں سے تمام تمدّنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں، تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشق الٰہی کہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدّن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے۔ لیکن اس ضمن میں ایک غور طلب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے، یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے اُن کے شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں قائم رہیں۔ میں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے، مگر چونکہ اب تک کسی قابلِ عمل نتیجے پر نہیں پہنچا اس واسطے فی الحال اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔"

اقبال کے کلام میں عورت کی جو عظمت ہے اس میں "ماں" کو بڑا مقام حاصل ہے۔ "بانگِ درا" میں انھوں نے اپنی والدہ کی وفات پر جو دردناک مرثیہ بعنوان "والدہ مرحومہ کی یاد میں" نظم بند کیا ہے اسے پڑھ کر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگتے ہیں۔ ماں کی مہر و محبت اور تربیت و پرورش کی جاں فشانی کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے: (۲)

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! تیرا انتظار؛
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار؛
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزّت ہوا
دفتر ہستی میں تسی زرّیں ورق تیری حیات
تسی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

مرثیہ کے آخر میں ماں کے لیے یوں دعا گو ہیں:(۳)

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبال کے کلام میں عورت سے عشق بہت کم ہے۔ صرف "بانگِ درا" کے دوسرے حصّے میں جو یورپ میں لکھا گیا تھا دو نظمیں ایسی ہیں جن میں عورت سے عشق نمایاں ہے۔ ایک "حسن و عشق" اور دوسرے "..... کی گود میں بلّی دیکھ کر" دونوں نظمیں انگریزی اور یورپی رومانی شاعری کے روایاتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اور رومانی انداز سے جنسی عشق کا ڈانڈا عشق مطلق کے تصوّرات سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد اقبال کے کلام میں نسوانی حسن سے تاثر کی کچھ جھلک "بال جبریل" کی اُن نظموں میں ملتی ہے جو یورپ کے دوسرے سفر میں لکھی گئی تھیں۔ یہ اقبال کی پیری کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں بڑی سنجیدہ شوخی ہے۔ مثلاً اُن کی سب سے دقیق اور شاید سب سے اچھی نظم "مسجد قرطبہ" میں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشین

ہوائے قرطبہ ہی کے اثر سے اور کچھ شعروں میں عورت کا وہ حسن جھلکتا ہے مگر رنگ واعظانہ ہے:

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب
دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب (۴)

اقبال نے نسوانی کرداروں کے سلسلے میں زیادہ تر اسلام کی مقتدر ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی نگاہوں میں حضرت فاطمہ

زہراؓ کا مقام نہایت ارفع ہے۔ وہ خواتین کو اُن کے اسوہ حسنہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اُن کا کردار ہمارے لیے مشعل راہ ہے فرماتے ہیں:(۵)

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
ماررا را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آن گونہ سوخت
با یہودے چادر خود را فروخت
نوری وہم آتشی فرمانبرش
گم رضائش در رضائے شوہرش
آن ادب پروردۂ صبرورضا
آسیا گرداں ولب قرآں سرا

اُن کی نگاہوں میں عورت کا مقام نہایت اعلیٰ ہے وہ جہاں بھی موقع پاتے ہیں انھیں خراج تحسین ادا کرتے ہیں ان کی خوبیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے کو ان سے متعارف کراتے ہیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وقت کے ہاتھوں ہم انھیں فراموش کر جائیں۔ چنانچہ ایک لڑکی "فاطمہ بنت عبداللہ" جو طرابلس کی لڑائی میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی۔ اس کی جان نثاری پر انھوں نے ایک نظم لکھی۔ اس کے چند اشعار یوں ہیں:(۶)

فاطمہ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ وسپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبال "شرف النساء" کی بھی مدح سرائی کرتے ہیں۔ شرف النساء بیگم عبدالصمد خاں صوبہ دار پنجاب کی دختر نیک اختر اور نواب زکریا خان کی بہن تھیں۔ اقبال کو اس پاک باز خاتون سے بڑی ارادت و عقیدت تھی۔ سبب یہ ہے کہ یہ خاتون حقیقی معنی میں مومنہ قانتہ تھی۔ مرحومہ کو تلاوتِ قرآن سے عشق تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے محل کے ایک گوشہ میں ایک بلند چبوترہ تعمیر کرایا تھا۔ اس پر بیٹھ کر نہایت ذوق و شوق کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت کرتی تھیں اور بوقتِ تلاوت شمشیرِ مرصع اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ بوقت وفات انھوں نے اپنی مادر مشفقہ سے التجا کی کہ میری قبر اسی چبوترے پر بنائی جائے اور میرا قرآن

اور میری تلوار دونوں چیزیں میری قبر کے تعویذ پر رکھ دی جائیں۔ چنانچہ شرف النساء کی وصیت کی تعمیل کی گئی۔ ۱۸۴۰ء تک قرآن مجید اور تلوار بدستور تعویذ پر رکھے رہے۔ لیکن جب سکھوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ایک لالچی سکھ اس خیال سے کہ شاید اس مقبرہ میں مال و دولت محفوظ ہے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوا مگر وہاں قرآن و شمشیر کے علاوہ اور کیا دھرا تھا۔ (۷)

نظم قصر شرف النساء کا آخری بند یوں ہے: (۸)

عمر ہادر زیرایں زرّیں قباب
برمزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہان بے ثبات
اہلِ حق راداد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد باخود آنچہ کرد
گردشِ دوراں بساطش درنورد
مردِ حق از غیر حق اندیشہ کرد
شیرِ مولا رُوبہی راپیشہ
ازدلش تاب و تب سیماب رفت
خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را بِبرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

اقبال، قرۃ العین طاہرہ جس کا اصل نام زرّین تاج تھا اس کی تعریف میں بھی رطب اللساں ہیں۔ طاہرہ، حاجی ملا محمد صالح کی بیٹی تھی، اس کا باپ قزوین (ایران) کا باشندہ تھا۔ اسی شہر میں اس کی ولادت ہوئی، بہت ذہین اور ذکی تھی۔ جوان ہوئی تو باپ نے اپنے چھوٹے بھائی ملا محمد تقی مجتہد کے بیٹے ملا محمد سے شادی کردی۔ شادی کے بعد اس نے باب مذہب اختیار کرلیا۔ ترکِ مذہب کے جرم میں ۱۸۵۲ء میں گرفتار ہوئی اور اس پاداش میں قتل کردی گئی۔ جان دے دی مگر تادم آخر اپنے مذہبی مسلک پر ڈٹی رہی۔

اقبال یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان طاہرہ کی طرح عشقِ صادق اختیار کرے۔ یعنی جس طرح اُس نے اپنے نصب العین کے لیے اپنی جان قربان کردی اسی طرح کوئی مسلمان اپنے مقصود کے لیے جان دینے سے گریز نہ کرے۔ طاہرہ کو کسی فانی انسان سے محبت نہ تھی بلکہ اسے اپنے مسلک سے عشق تھا اُس نے تادم آخر اپنے مسلک کی تبلیغ کی دُنیا کی کوئی طاقت اُسے اپنے مقصد حیات سے باز نہ رکھ سکی۔ طاہرہ کا یہ انداز اقبال کو بے حد پسند آیا۔ جس کے لیے انھوں نے اس غزل کو "جاوید نامہ" میں شامل کیا۔ تاکہ مسلمانوں کے دل میں نصب العین کے حصول کی خاطر سر کٹانے کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ (۹) اس غزل کے دو شعر یہ ہیں: (۱۰)

مہر ترا دل حزیں بافتہ برقماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو
در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا

صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

اقبال نے جہاں اپنی شاعری میں مندرجہ بالا قابل احترام ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں انھوں نے بے راہ رو "دوشیزۂ مریخ کہ دعوائے رسالت کردہ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس "نبیۂ مریخ" کا خاکہ یوں اُتارا ہے:(۱۱)

چہرہ اش روشن ولے بے نور جاں
معنی او بربیانِ او گراں
حرفِ او بے سوز و چشمش بی نمی
از سرودِ آرزو نامحرمی
فارغ از جوشِ جوانی سینہ اش
کور و صورت ناپذیر آئینہ اش
بی خبر از عشق واز آئینِ عشق
صعوۂ رد کردہ از شاہینِ عشق

"نبیۂ مریخ" مغربی تہذیب کی پروردہ تھی جس نے اس میں بے باکی کی خو پیدا کردی تھی جس کی وجہ سے وہ دیگر عورتوں کو قانون فطرت کے خلاف بغاوت پر اُبھار رہی تھی۔ وہ تجرد کی زندگی بسر کرنا قابل فخر سمجھتی تھی۔ وہ مردوں یعنی شوہروں کے تابع رہنا قابل شرم خیال کرتی ہے، کیونکہ اس کے خیال میں یہ مظلومی، محکومی اور محرومی کی نشانی ہے۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:(۱۲)

اے زنان! اے مادراں اے خواہراں
زیستن تاکے مثال دلبراں
دلبری اندر جہاں مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است
درد و گیسو شانہ گردانیم ما
مرد را نخچیرِ خود دانیم ما
مرد صیادی بہ نخچیری کُند
گردِ تو گردد کہ زنجیری کُند
خود گداز یہاے او مکرو فریب
درد و داغ و آرزو مکرو فریب
گرچہ آں کافر حرم سازد ترا
مبتلائے درد و غم سازد ترا
ہمسرِ اُو بودن آزارِ حیات
وصلِ او زہر و فراقِ او نبات

مار پیچاں از خم و پیچش گریز
زہرہایش را بخون خود مریز
از امومت زرد روے مادراں
اے خنک آزادیٔ بے شوہراں

آخر میں "نبیہ مریخ" عورتوں کو پرزور تاکید کرتی ہے کہ وہ فطرت کے خلاف اپنی جدوجہد کو تیز کردیں تاکہ غلامی کی زنجیروں سے رہائی حاصل کی جاسکے۔ وہ مردوں سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر کے "توحید" کی زندگی بسر کرنا قابل فخر سمجھتی ہے۔(۱۳)

خیز و بافطرت بیا اندر ستیز
تا زپیکار تو حُر گردد کنیز
رُستن از ربطِ دوتن توحید زن
حافظ خود باش و برمرداں متن

لیکن "نبیہ مریخ" کی تعلیم اسلامی قدروں کے ایک دم منافی ہے۔ اسلام نے مرد کو عورت کا محافظ بنایا ہے۔ اس کا نگران متعین کیا ہے لہٰذا عورت کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا مرد کا فرضِ اوّل ہے۔ مرد کو عورت پر اسی لیے فضیلت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر طرح عورت کی حفاظت کرنا مرد کی ذمہ داریوں میں داخل کردیا ہے۔ جس قوم کے مرد اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے وہ قوم ذلت کی گہرائیوں میں جاگرتی ہے:(۱۴)

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

لہٰذا عورت مرد کی دست نگر ہے، اُس کے جوہر مرد کے بِنا نہیں کھل سکتے۔ مرد کے لمس کے بغیر عورت کا وجود بے کار ہے۔ مرد کی رفاقت کی آگ اسے تابناکی بخشتی ہے۔(۱۵)

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتہ شوق
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرار حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

لیکن بعض اوقات مرد کی جاو بے جا تابعداری سے عورت کا دل مغموم ہوجاتا ہے۔ اقبال نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن اس سے چھٹکارا کسی طرح ممکن نہیں کہ یہی آئینِ فطرت ہے"(۱۶)

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

یورپی نظام کی دیگر خرابیوں میں سے ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس نے عورت کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا اس کی فضیلت کو سمجھنے میں کوتاہی برتی۔ مردِ فرنگ کی اس سادگی اور کوتاہ فہمی کی نشان دہی اقبال نے یوں کی ہے:(۱۷)

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اقبال عورتوں کے لیے اتنی ہی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جس سے ان کے دینی اور دنیاوی مسائل حل ہوسکیں، عصمت و عفت اور عشق و محبت کے جذبات دل میں موجزن رہیں، فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی نہ پیدا ہوجائے۔ لیکن جس تعلیم سے عورتوں کی نسوانیت پر آنچ آتی ہے اور ان کی زنانہ خوبیاں تباہ ہوجاتی ہیں اقبال اس طرح کی تعلیم سے بیزار ہیں:(۱۸)

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اس علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے گر مدرسۂ زن
ہے عشق و مودت کے لیے علم و ہنر موت

اقبال کے نزدیک پردہ عورت کی ایک بہترین خوبی ہے۔ پردے کے بارے میں اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:(۱۹)

"ہندوستان میں پردے پر سخت زور دیا جانا اخلاقی وجوہ پر مبنی ہے۔ چونکہ اقوام ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ بہت ترقی نہیں کی، اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کردینا میری رائے میں قوم کے لیے نہایت مضر ہوگا۔ ہاں اگر قوم کی اخلاقی حالت پھر ایسی ہوجائے جیسی کہ ابتدائے زمانہ اسلام میں تھی تو اس کے زور کو بہت کم کیا جاسکتا ہے، اور قوم کی عورتوں کو آزادی سے افرادِ قوم کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے کی عام اجازت ہوسکتی ہے۔"

پردے سے اقبال کی مُراد شرم و حیا کی بجا آوری اور بے گانہ مردوں سے غیر ضروری میل جول سے انحراف ہے وہ کہتے ہیں کہ پردہ سے عورت کی عزت بڑھ جاتی ہے اور ان کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بے پردگی کو سماج کے تنزل کا باعث قرار دیتے ہیں۔ اسی

لیے وہ عورتوں کو اس راستے پر چلنے سے ایک دم منع کرتے ہیں جو انھیں "نمائیش گاہ" بنادے۔ ایسے رجحانات خیالات کو پراگندہ اور دل کو مکدّر بنادیتے ہیں اور انھیں بے باکی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اس لیے اقبال انھیں ایسے محرکات سے روکتے ہیں۔ اُن کے خیال میں جس عورت میں پردہ کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے اس میں خودی زیادہ مضمر ہوتی ہے:(۲۰)

رُسوا کیا اُس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینہ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہوجاتے ہیں افکار پراگندہ وابتر
آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

مغربی دنیا میں عورت کی آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کا نثری بیان یوں ہے:(۲۱)

مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کردی ہے، عورتوں کا آزاد کردیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بھی بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہوجائیں گی۔

علامہ اقبال نے مثنوی "رموز بیخودی" میں ایک مثالی عورت کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:(۲۲)

عشق حق پروردۂ آغوش او
ایں نوا از زخمۂ خاموش او
آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود باطیب وصلوٰات
گفت آں مقصودِ حرفِ کُن فکاں
زیر پائے اُمہات آمد جناں
ملت از تکریم ارحام است وبس
ورنہ کار زندگی خام است وبس

مثنوی "رموز بیخودی" میں ہی ایک نظم "خطاب بہ مخدرات اسلام" ہے۔ اس میں صنفِ نازک کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:(۲۳)

اے روایت پردۂ ناموس ما
تاب تو سرمایۂ فانوس ما
طینتِ پاکِ تومارا رحمت است
قوت دین واساسِ ملت است

کودک ما چوں لب از شیر تو شست
لاالہٰ آموختی او را نخست
می تراشد مہرِ تو اطوار ما
فکرِ ما، گفتارما، کردارما،
اے امینِ نعمت آئینِ حق
در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق
آب بندِ نخل جمعیت توئی
حافظ سرمایۂ ملت توئی
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اُسوۂ زہرا امبند
تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسمِ پیشِ بہ گلزار آورد

چنانچہ عورتوں کے نام اقبال کا پیغام یہ ہے کہ چونکہ عورت ملت کی بقا واستحکام کی ذمہ دار ہے اس لیے تعلیم دین اور اسرار قرآن سے واقفیت اس کے لیے بہ غایت لازم ہے۔ کیونکہ اسی کی گود سے حامیانِ ملت پرورش پا کر دنیا میں اجاگر ہوتے ہیں۔ ایک مثالی ماں میں ہمت، ولولہ، شجاعت، صداقت اور جوش عمل جیسے محاسن ہونے چاہیے۔ تاکہ فرزندان قوم بھی مکارم اخلاق سے آراستہ ہوں۔ قوم کی فلاح و بہبود عورت سے وابستہ ہے اگر وہ اس معیار پر پوری نہیں اُترتی اور اس فریضۂ حیات کو بجالانے کی اہل نہیں ثابت ہوتی تو اس کا وجود بے کار ہے۔(۲۴)

جہاں را محکمی از اُمہات است
نہادشاں امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند
نظامِ کاروبارش بے ثبات است

اقبال عورتوں کی اخلاقی قدروں کو بے حد اہمیت دیتے ہیں اور ان کو بے جا زیب و زینت اور خود نمائی سے روکتے ہیں۔ "ارمغان حجاز" میں "دختران ملت" کے نام سے جو قطعات ہیں ان میں ان خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:(۲۵)

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا
مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمال غازہ پروردہ
بیاموز از نگہ غارت گری ہا

جنوری ۱۹۲۹ء میں "انجمن خواتین اسلام" کے جلسے میں عورتوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک مفصل تقریر پیش کی۔ جس میں انھوں نے اہم نکات پیش کئے جن کی تلخیص حسب ذیل ہے:(۲۶)

اول: اسلام میں مرد اور عورت میں قطعی مساوات ہے۔ قرونِ اولیٰ میں عورتیں جہاد میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہوئیں۔ خلیفہ کے انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور تھیں۔ اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں۔

دوم: عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص خاص علاحدہ فرائض ہیں ان فرائض میں اختلاف ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔

سوم: اسلام میں ماں بچوں کی وراثت کا حق رکھتی ہے۔ عورت چاہے تو نکاح کے وقت یہ شرط پیش کر سکتی ہے کہ اسے طلاق لینے کا حق دیا جائے۔ اسلام میں تعدد ازدواج کا حکم نہیں دیا گیا محض اجازت ہے۔ عورت چاہے تو نکاح کے وقت مرد سے مطالبے کا حق رکھتی ہے کہ وہ تعدد ازدواج کی اجازت کو اپنے حق میں ترک کردے۔ فقہ اسلامی میں بیوی بچوں کو دودھ پلانے کی اُجرت طلب کر سکتی ہے اور کھانا پکانے کی اُجرت بذریعہ عدالت حاصل کر سکتی ہے۔

چہارم: وہ حق جس کا عورت انصاف کے ساتھ مطالبہ کر سکتی ہے وہ قرآن پاک نے دے رکھا ہے اگر آپ اس سے جاہل و غافل رہیں یا اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں یا اس کے حاصل کرنے پر اصرار نہ کریں، بوقت ضرورت قانونی چارہ جوئی نہ کریں تو یہ قرآن یا شریعت اسلام کا قصور نہیں۔

علامہ اقبال نے صنف لطیف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس باب میں انھوں نے اسلام کی صاف اور سادہ تعلیمات کا اعادہ کر دیا ہے۔ (۲۷) عورت کے بارے میں اقبال کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالرحمٰن طارق فرماتے ہیں: (۲۸)

"مجھے یقین ہے کہ آج تک ہمارے کسی شاعر یا فلسفی نے عورت کی سفارش اور حمایت ایسے شاندار اور بسیط پیرایہ میں ہرگز نہیں کی۔ یہ اقبال کا صنفِ نازک پر ایک بڑا احسان ہے۔ جس کا انھیں پوری فراخ دلی سے اعتراف کرنا ہوگا۔ جہاں مردوں کا یہ فرض ہے کہ وہ عورتوں کا صحیح احترام کرنا سیکھیں اور محض چار دیواری میں بند رہنے والا جانور نہ سمجھ کر شاہراہ زندگی میں انھیں ایک باوفا ساتھی کی حیثیت دیں۔ وہاں عورتوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے کو علامہ مرحوم کی بیان کردہ صفات کا پورا پورا مصداق ثابت کرنے کی کوشش کریں تاکہ اس ہم آہنگی سے ہماری ازدواجی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں کوئی خوشگوار انقلاب پیدا ہو۔" (۳۰)

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُر مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

حواشی

۱- ڈاکٹر محمد اقبال، مضامین اقبال صفحہ ۴۲
۲- ڈاکٹر محمد اقبال، بانگِ درا صفحہ ۲۵۶
۳- ایضاً صفحہ ۲۶۰
۴- عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل، لاہور ۱۹۶۸ صفحہ ۳۴۹-۳۵۰
۵- ڈاکٹر محمد اقبال، رموزِ بے خودی صفحہ ۱۵۳
۶- بانگ درا صفحہ ۲۳۹
۷- یوسف سلیم چشتی، شرح جاوید نامہ صفحہ ۱۰۲۰-۱۰۲۱
۸- ڈاکٹر محمد اقبال، جاوید نامہ صفحہ ۱۸۳
۹- شرح جاوید نامہ، صفحہ ۸۶۱
۱۰- جاوید نامہ، صفحہ ۱۳۷
۱۱- ایضاً صفحہ ۱۲۶
۱۲- ایضاً صفحہ ۱۲۷-۱۲۸
۱۳- ایضاً صفحہ ۱۲۹
۱۴- ڈاکٹر محمد اقبال، ضربِ کلیم صفحہ ۹۴
۱۵- ضربِ کلیم، صفحہ ۹۶
۱۶- ایضاً صفحہ ۹۶
۱۷- ایضاً صفحہ ۹۰
۱۸- ایضاً صفحہ ۹۵
۱۹- مضامین اقبال، صفحہ ۴۳
۲۰- ضربِ کلیم، صفحہ ۹۱-۹۲
۲۱- ڈاکٹر محمد اقبال، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، صفحہ ۱۰۲
۲۲- رموزِ بیخودی، صفحہ ۱۴۹-۱۵۰
۲۳- ایضاً صفحہ ۱۵۴-۱۵۵
۲۴- ارمغان حجاز صفحہ ۱۳۱
۲۵- ایضاً صفحہ ۱۳۰
۲۶- ڈاکٹر عبدالسلام خورشید سرگزشت اقبال، لاہور ۱۹۷۷ صفحہ ۲۶۴-۲۶۵
۲۷- عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، لاہور، ۱۹۶۷ صفحہ ۲۱۷
۲۸- عبدالرحمٰن طارق، جہانِ اقبال، لاہور، ۱۹۴۹ صفحہ ۴۶۸
۲۹- ضربِ کلیم صفحہ ۹۲

قومی زبان (۱۷) نومبر ۱۹۹۴ء

اقبال کا ایک نادر خط

شائستہ خاں

اقبال نے سر علی امام کے انتقال کے دوسال بعد ان کی بیگم لیڈی انیس امام کی فرمایش پر کچھ شعر اور قطعے انھیں ایک خط میں بھیجے۔ (۱) خط کا ترجمہ اور وہ شعر مندرجہ ذیل ہیں۔

۳۰/دسمبر ۱۹۳۴ء

مائی ڈیر لیڈی امام

یہ چند شعر ارسال ہیں آپ ان میں سے کوئی ایک ٹکڑا منتخب فرما سکتی ہیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال لاہور

(۱)

بروں زیں گنبد در بستہ پیدا کردہِ ام را ہے
کہ ازاندیشہ برترمی پرد آہِ سحر گاہے
زجوے کہکشاں بگذر، زنیل آسماں بگذر
زمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے

(۲)

دلِ من رازدانِ جسم و جان است
نہ پنداری اجل برمن گران است
چہ غم گریک جہاں گم شد ز چشم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

(۳)

نگر دد زندگانی خستہ از کارِ جہاں گیری
جہا نے در گرہ بستم جہانِ دیگرے پیش است

(۴)

خوشا کسے کہ حرم را درونِ سینہ شناخت
دمے پدید و گذشت از مقام گفت و شنود

(۵)

عشق شور انگیز راہر جادہ در کوے تو برد
بر تلاش خودچہ می نازد کہ رہ سوے تو برد

(۶)

شوق اگر زندۂ جاوید نباشد عجب است
کہ حدیث تو درس یک دو نفس نتواں گفت

(۷)

من اے دریائے بے پایاں بموج تو در افتادم
نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

ہم ان اشعار کی اس اہمیت اور معنویت کی طرف خصوصی توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ یہ کہے تو جائیں ۱۹۱۵ء ۱۹۳۰ء کے درمیان، لیکن بیک وقت اور بیک جنبش فکر ۳۰/ دسمبر ۱۹۳۴ء کو موت اور زندگی کے مسائل پر ہمہ وقت سوچنے والے مفکر شاعر کے قلم سے یک لخت و یکجا ٹپک پڑیں۔ ایسے اشعار جن میں موت پر زندگی کی فتح صاف صاف بڑی واضح اور روشن نظر آتی ہے۔ کیا یہ محض امام کے کتبے کے اشعار ہیں؟ کیا اس میں خود ان کے اپنے نفسیاتی فکر کا پورا پیچ و تاب، موت کے پر اسرار پردے کے پیچھے جھانکنے اور شاید اس پردے کو بیتابانہ اُلٹ دینے کی آخری کوشش نظر نہیں آتی ہے؟ وہ زندگی بھر اس پردے کو الٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش کی تفصیل پھر کبھی لیکن۔ ذرا دیکھیے تو:

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند
انسان بمیرد از بے یقینی

کے خالق نے یہاں ان کتباتی اشعار میں سے ہر شعر میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہاں سے وہاں تک سفر کو کس خوبصورتی سے ایک نہ ٹوٹنے والے تسلسل میں باندھ دیا ہے اور اس تسلسل کے دوسرے سرے پر آنے والے دور کو کیسی دلاویزی بخش دی ہے۔

اس خط میں منقول اشعار کی مذکورہ اہمیت اور زیادہ گہری معنویت میں ڈھل جاتی ہے۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ وہ

وقت ہے جب تصورِ موت پر فتح پالینے والے جیالے شاعر کے مرض الموت کا آغاز ہوچکا ہے اور ابھی ساڑھے چار سال کی مدّت بھی ختم نہ ہوگی کہ نئی منزلوں کا متلاشی موت کی وادی کو پھلانگ کے نئے سفر پر روانہ ہوچکا ہوگا۔ ایسے میں کیا یہ سب اشعار صرف علی امام کے لیے محدود رہ جاتے ہیں؟ یا سب کے سب خود ان اشعار کے خالق کے لیے ہیں جو موت پر فتح مندی کے بعد حقیقت برتر کی تلاش میں سرگرداں ہے؟ اور کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ حقیقت کا بیچین متلاشی، موت پر فتح تو اسی دن پاچکا تھا جب اس کی فکرِ شعری نے زندگی اور موت کے سانچے اس طرح ڈھالنے شروع کردیے تھے:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

(۳)

سر علی امام (۱۸۶۹ء - ۱۹۳۲ء) کے نام سے اہلِ علم واقف ہوں گے، اقبال نے اپنی پہلی شعری تصنیف "اسرار خودی" کے پہلے ایڈیشن کو انھیں کے نام معنون کیا تھا۔ علی امام، امداد امام اثر کے صاحبزادے تھے۔

امداد امام اثر (۱۸۴۹ء - ۱۹۳۴ء) کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے علمی کارنامے اور ان کی شاعری باسانی انھیں اردو ادب میں اپنے عہد کی سب سے قدآور شخصیتوں میں لے آتے ہیں۔ نقاد اور سخن فہم کی حیثیت سے ان کا نام آزاد، حالی اور شبلی کے فوراً بعد آتا ہے اور شاعری خصوصاً غزل اس درجے کی ہے کہ حسرت موہانی جیسے سخن شناس بھی ان کے قائل تھے۔

امداد امام اثر کے صاحبزادے سر علی امام ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء میں نیورہ (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بیرسٹری کے لیے لندن کا سفر کیا (۱۸۸۷ء)

پھر لندن سے بیرسٹر بن کر آئے (جون ۱۸۹۰ء) تو پہلے کلکتہ ہائی کورٹ میں اور پھر جب ہائی کورٹ پٹنہ میں کھل گیا تو ۱۹۱۴ سے پٹنہ میں پریکٹس کی۔

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ڈھاکہ میں بنا پڑی تو اس میں حکیم اجمل خاں، علی برادران، وقار الملک، محسن الملک وغیرہ کے علاوہ سر علی امام بھی اُن اہم بنیادی اور اہم لوگوں میں شامل تھے اور اگلے سال جب کراچی میں اس کا اجلاس ہوا تو اجلاس کراچی کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے۔ (۱)

مسلمانانِ ہند کو سیاسی دلچسپیوں سے کسی بھی حال میں بے توجہی نہیں برتنی چاہیے۔ حکومت ہند اُن سے مصالحت کرنے پر آمادہ ہے۔ وہ اس موقع کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر ایک بار مسلمانوں نے اپنی منزل متعین کرلی اور دوسری قوموں نے انھیں متحد دیکھ لیا تو یقیناً اُن کی عزّت کریں گے اور اُن کے ساتھ تعاون بھی۔ (۲)

۱۹۰۸ء کے آغاز میں وہ مسلم لیگ کی مرکزی مجلس کے ممبر منتخب ہوئے اور صوبہ بہار کی شاخ کے صدر اسی سال لیگ کے

امرت سر سیشن کی صدارت کی۔ (۳) ان کے اس صدارتی خطبے کے الفاظ آج بھی وہی جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں جو اس وقت کے سننے والوں میں ہوا ہوگا۔

ہم "ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں ملّتوں کے افراد سے کم اپنی جنم بھومی سے محبت نہیں کرتے۔ صدیوں کی مقدس وابستگی نے ہمیں اس کی محبت میں باندھ رکھا ہے اور اپنی مادرِ وطن کا آدر کرنے اور اس سے پریم کرنے میں کسی سے ذرّہ برابر ہرگز کم تر نہیں ہیں۔" (۵)

۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کا جو وفد وزیر ہند مورلے سے ملنے لندن گیا تو اس میں سر علی امام بھی شامل تھے۔ شملہ وفد کے بعد یہ پہلا تاریخی وفد تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھیں مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ (۶) اور ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ پیکٹ ہوا، جس میں لیگ اور کانگریس دونوں وطن کے لیے ایک مشترک پلیٹ فارم بنانے پر متفق ہوگئے، اس میں بھر سر علی امام ہر جگہ شریک غالب تھے۔

قومی سطح پر ہر بڑے فیصلے میں شمولیت کے علاوہ، خود اپنے صوبے بہار کو ایک الگ شناخت مہیا کرنے کے لیے انھوں نے اسے بنگال سے الگ ایک باقاعدہ ریاست کا درجہ دینے کے واسطے جو شاندار جدوجہد کی، وہ تاریخ کا ایک حصّہ بن چکی ہے، جس کا ایک روشن باب وہ تھا جب انھوں نے ۱۹۰۸ء میں بہار صوبائی کانفرنس کی صدارت کی تھی۔

اپنی قانونی شہرت اور بیرسٹری کی پریکٹس میں نمایاں کامیابی کے سبب انھیں ۱۹۱۰ء میں وائسرائے کی کونسل کا ممبر منتخب کر لیا گیا (گویا وزیرِ قانون) کونسل کی ممبری کے زمانے میں انھوں نے ہی وائسرائے کو اس طرف راغب کیا کہ ان امور پر ایک تفصیلی منصوبہ بند نوٹ لندن میں وزیر ہند کو بھیجیں۔ اس نوٹ میں پہلی بار ہندستانی صوبائی خود مختاری دینے کی واضح سفارش کی گئی تھی جو بالآخر ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی صورت میں سامنے آئی۔ اسی نوٹ میں بہار اور اڑیسہ کو بنگال سے الگ کیے جانے کی صریح سفارش شامل تھی۔ یہ نہیں ہے کہ ان دونوں امور کے حصول میں تنہا ایک فرد علی امام کا ہاتھ رہا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں ان کا رول ممتاز ترین تھا۔ بہار کے معاملے میں تو اسی لیے انھیں جدید بہار کا جنم داتا FATHER OF MODREN BIHAR کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بہار اور اڑیسہ کا صوبہ قائم کرنے میں سر علی امام نے ایک خاموش مدبّر، بیدار مغز، سیاست داں اور ایک عظیم مفکّر کا کردار ادا کیا ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر ہند نے بانکی پور پٹنہ کے ایک جلسہ میں اسی کا اعتراف (۷) کیا تھا کہ سر علی امام جدید بہار کے جنم داتا ہیں۔ SIR ALI IMAM IS THE FATHER OF MODREN BIHAR یہ وُہی دور ہے جب ان کے مشورے پر ہندوستان کا دارالخلافہ بھی کلکتے سے دہلی منتقل ہوگیا تھا۔

۱۹۱۷ء میں سر علی امام پٹنہ ہائیکورٹ کے جج ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں گورنر بہار کی EXECUTIVE CONUCIL (مجلسِ عاملہ) کے ممبر۔ اگست ۱۹۱۹ء میں ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم ہوئے۔ (۸) جہاں تین سال تک کام کیا۔ حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ کے دور میں لیگ آف نیشنز بنی جس میں یہ ہندوستان کا پہلا نمایندہ بنا کر بھیجے گئے۔

۱۹۲۲ء میں برار کو حیدر آبار کو واپس دلانے کے مقدمے کی پیروی کے فرائض سر علی امام کے سپرد ہوئے، جس کے لیے یہ لندن گئے۔ برار تو نہ ملا لیکن کچھ مراعات ضرور حاصل ہوگئیں اور حیدر آباد کے ولی عہد کو پرنس آف برار (PRINCE OF BARAR) تسلیم کر لیا گیا۔

۱۹۲۴ء میں دوبارہ پٹنہ ہائیکورٹ کے جج ہوئے ۱۹۲۵ء میں سر علی امام نے علیگڑھ جوبلی کے موقع پر جشن کی صدارت کی۔ ۱۹۲۷ء نہرو رپورٹ نکلی، مسلمانوں میں راجہ محمود آباد، ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری کے علاوہ اس پر سر علی امام کے دستخط بھی تھے سر علی امام اور راجا محمود آباد آپس میں سمدھی تھے یعنی سر علی امام کا لڑکا اور راجا محمود آباد کی لڑکی نہرو رپورٹ کی تائید میں

لکھنؤ میں انھوں نے زبردست تقریر کی تھی۔ اس موقع پر جب سائمن کمیشن آیا تو مخالفت میں لیگ کے دو گروپ ہوگئے۔ شفیع لیگ جس میں اقبال تھے، اس نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا تھا سر علی امام اسی گروپ میں شامل تھے۔

سر علی امام عام طور سے انگریزی بولتے تھے، لیکن اردو پر بھی دسترس تھی، اور ضرورت پڑنے پر اردو میں بھی تقریر کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں شرکت ان کی آخری سیاسی سرگرمی تھی۔ سر علی امام کے ساتھ بہار سے شفیع داؤد بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ کانفرنس میں انھوں نے ایک تقریر بھی کی، پھر بیمار ہوگئے۔ اس سے قبل کی کانفرنس نے ایک اور زعیم ملّت محمد علی کی تو لندن ہی میں جان لے لی تھی، لیکن سر علی امام ہندوستان واپس آئے۔ البتہ اس بیماری سے بہت دن تک جانبر نہ ہوسکے۔

زندگی کا آخری حصّہ زیادہ تر رانچی میں کوٹھی کی تعمیر کی مصروفیت میں گزرا۔ رانچی میں اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں اپنی نیم تعمیر شدہ کوٹھی ("انیس کاسل" بنوائی جس کا نام انھوں نے اپنی تیسری بیوی کے نام رکھا تھا) کے احاطے میں دفن ہوئے۔ رانچی سے کئی میل کے فاصلہ پر یہ ایک پُرسکون کوٹھی جس کے گرداگرد ایک بہت بڑا باغ ہے، یہ لق و دق کوٹھی اب مدّت سے ویران پڑی ہے جہاں نہ چراغ جلتے ہیں نہ پھول چڑھتے ہیں۔ نہ کسی شمع پر کوئی پروانہ جلنے جاتا ہے۔ نہ کسی گل کی جستجو میں کسی بلبل کی صدائیں گونجتی ہیں، بس ایک ہو کا عالم ہے! رہے نام اللہ کا!!

(۴)

سر علی امام کی وفات (۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء) کے کچھ عرصے بعد جب قبر پر کتبہ لگائے جانے کی بات آئی تو لیڈی انیس امام نے اقبال سے خواہش ظاہر کی۔ جواباً اقبال نے ایک خط کے ساتھ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نو شعر بھیجے۔ سب فارسی کے ہیں اور خط کی تمہیدی سطریں انگریزی میں۔

اقبال کا وہ اہم خط ملاحظہ کے لیے عکساً درج ذیل ہے۔

Sir Mohd Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.

Lahore

Dated ____ 193

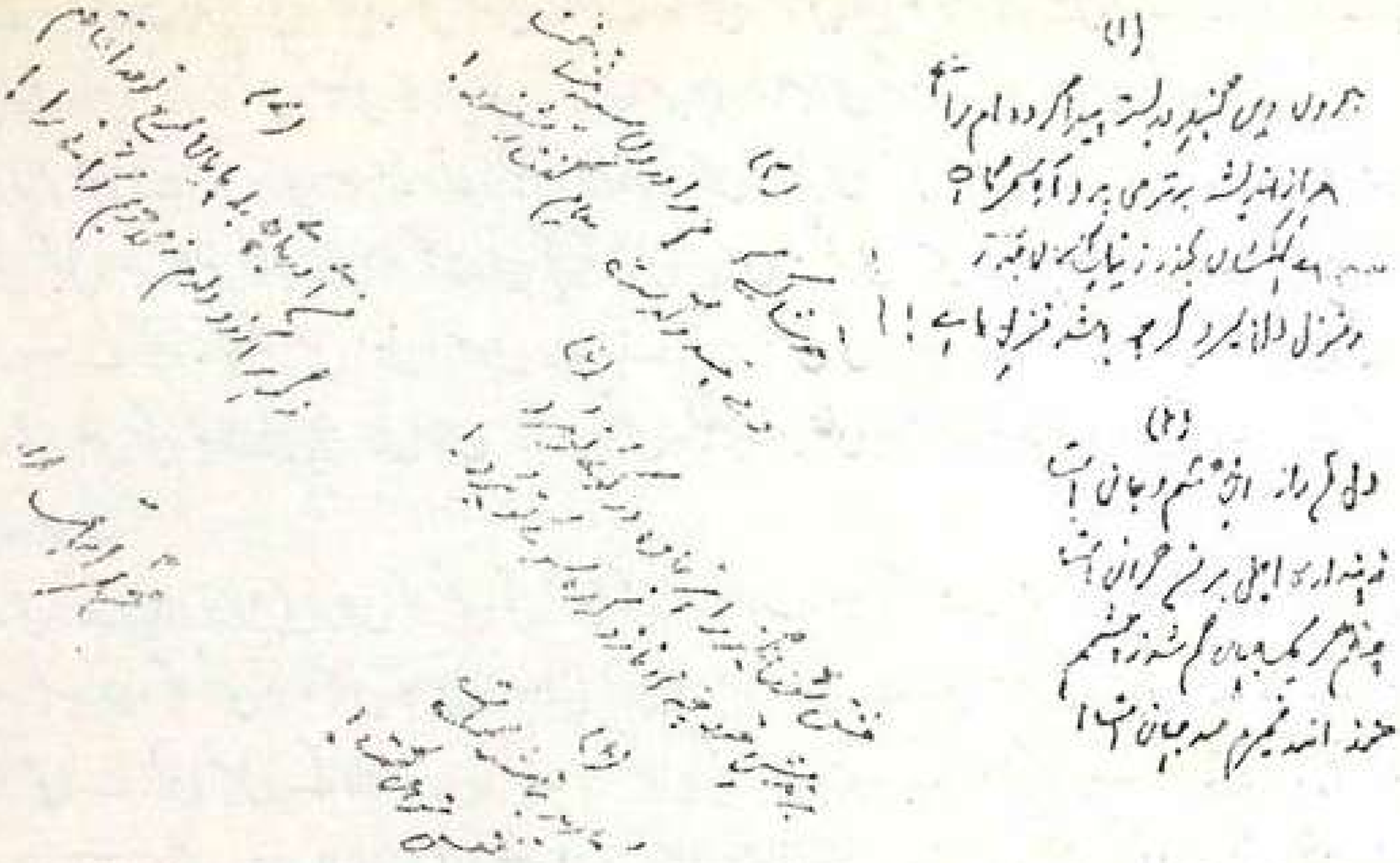

خط میں درج ذیل اشعار کو یہاں اقبال کے مجموعوں میں جہاں جہاں یہ قبلاً چھپ چکے ہیں ان کے حوالے کے ساتھ درج کیا جارہا ہے۔ ایک قطعہ "پیامِ مشرق" سے اور ایک کے سوا باقی اشعار زبورِ عجم سے لیے گئے ہیں۔

(۱)

بروں زیں گنبدِ در بستہ پیدا کردہ ام راہے
کہ از اندیشہ برتر می پرد آہِ سحر گاہے
زجوے کہکشاں بگذر زنیل آسماں بگذر
زمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے

(زبورِ عجم، غزل نمبر ۳۴ ص ۱۰۰/۴۹۲)

(۲)

دل من راز دانِ جسم و جان است
نہ پنداری اجل برمن گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد زچشم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

(پیامِ مشرق، نمبر ۱۱۱ ص ۶۲/۲۳۲)

(۳)

نگر دو رگانی خستہ از کار جہاں گیری
جہانے در گرہ بستم جہانِ دیگرے پیش است

(زبور عجم، غزل نمبر ۴۱ ص ۴۴/۴۳۶)

(۴)

خوشا کسے کہ حرم رادرونِ سینہ شناخت
دمے پدید گذشت از مقام گفت و شنود

(زبور عجم، غزل نمبر ۵۰ ص ۱۱۸/۵۱۰)

(۵)

عشق شور انگیز راہر جادہ در کوئے تو بُرد
برتلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوے تو برد

(زبور عجم، غزل نمبر ۱ ص ۵/۳۹۷)

(۶)

شوق اگر زندہ جاوید نباشد عجب است
کہ حدیث تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

(زبور عجم، غزل نمبر ۴۴ ص ۴۶/۴۳۸)

(۷)

من اے دریائے بے پامال بموج تو در افتادم
نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

(زبور عجم، غزل نمبر ۵۱ ص ۵۴/۴۴۶)

(۵)

یہاں ان اشعار کے معنی پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا:

(۱) بند دروازوں کے اس گنبد (آسمان سے گھری ہوئی ہماری زمین) سے باہر جانے کے لیے میں نے راستہ بنالیا ہے اور وہ بھی ایسے کہ ایک آہِ سحر گاہی کا سہارا لے لیا ہے جو گمان و تخیل سے بھی تیز تر اور دور تر پرواز کرتی ہے جوے کہکشاں سے گزر جا، گزر جا نیلے آسمان سے!! منزل مل جائے، تو دل مرجاتا ہے، اب وہ منزل چاہے چاند ہی کی منزل کیوں نہ ہو!

(۲) میرا دل جسم و جاں کے راز جانتا ہے یہ مت سمجھنا کہ موت میرے اوپر بھاری ہے مجھے اس کا کیا غم کہ ایک دنیا میری آنکھ سے اوجھل ہوگئی، ابھی تو سو دنیائیں میرے اپنے ضمیر میں (پنہاں) موجود ہیں۔

(۳) دنیا کے کاروبار پر گرفت سے زندگی تھکتی نہیں ہے۔ ایک اور دنیا کا قصہ تو میں نبٹا چکا ہوں، اب ایک دنیا کا کاروبار سنبھالنے لگا۔

(۴) کیسا خوش نصیب ہے وہ، جس نے حرم کو اپنے سینے کے اندر پہچان لیا، اور پھر بس ایک لمحے کے لیے اس کی تپش میں جلا، اور کہنے سننے کے مقام سے گزر گیا۔

(۵) عشق شور انگیز کو تو ہر راہ تیرے کوچے کی طرف ہی لے گئی۔ اب وہ اپنی تلاش پر ناز بھی کرے تو کیا کہ جو راہ بھی جاتی ہے وہ تیری طرف ہی لے جاتی ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون)

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائے گا
درد مندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

(۶) شوق اگر زندۂ جاوید نہ ہو تو مجھے بڑا عجب سا لگے گا کہ موت آئے اور پھر یہ سمجھا جائے کہ بس اس پر آدمی کا سفر ختم ہوا! کیوں کہ تیری بات کہنے کے لیے ان دو ایک سانسوں سے تو کام چلنے سے رہا۔

(۷) اے میرے بے تھاہ سمندر، میں تو بس تیری لہروں میں رُل مل گیا ہوں، مجھے نہ موتی کی آرزو ہے نہ ساحل کی۔

کتبے پر لکھے جانے کے لیے ان اشعار سے زیادہ موزوں کوئی شعر کسی بھی شاعر کے یہاں شاید ہی ملے ہوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار گویا اقبال نے صرف اور صرف سر علی امام کے کتبے کے لیے ہی لکھے ہوں علی امام جن کی وہ دل سے بے انتہا قدر کرتے تھے اور جن کے لیے یہ اشعار جیسے اقبال کے دل سے اٹھے ہوں اور وہ صرف علی امام کے لیے ہی کہے گئے ہوں (حالانکہ یہ اشعار سر سیّد علی امام کی موت سے بہت پہلے وجود میں آچکے تھے) اقبال کے یہاں موت اور زندگی کا جو فلسفہ ہے اس کا نچوڑ (عطر) ان اشعار میں آگیا ہے اور ہر لحاظ سے زندگی اور موت کے بارے میں یکجا ان کا فلسفہ، اس خوبصورتی سے کہیں دور نہیں ملے گا۔

حواشی

(۱) مندرجہ بالا خط سر علی امام کی بہو بیگم عزیزہ امام نے ہمیں عنایت فرمایا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ امتداد زمانہ نے جو اس خط پر اثر ڈالا ہے اس کے رو سے پہلے شعر کے تیسرے مصرع کا ابتدائی لفظ، زجوے محفوظ نہیں رہا ہے۔

(۲) محمد انیس الرحمن انیس سر علی امام، ص ۸

(۳) ڈکشنری آف نیشنل بیلوگرافی ص ۱۳۹ جلد اوّل

(۴) ڈاکٹر سچد انند سنہا (SOME EMINENT BIHAR CONTEMPORARIES)

(۵) بہار کا نیا رسالہ، ندیم اکتوبر ۱۹۳۲ء

(۶) محمد انیس الرحمن انیس سر علی امام ص ۸

(۷) حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ کا قبول کرنا ان کا سب سے زیادہ غیر اطمینان بخش دور تھا اور ڈاکٹر سچد آنند سنہا (SOME EINENT BIHAR CONTEMPORARIES) کے خیال میں ان کی (سر علی امام) کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی شاید اسی لیے وہ وہاں پانچ سال کی مدت بھی پوری نہ کر سکے۔

قومی زبان (۲۵) نومبر ۱۹۹۴ء

اُردو غزل اور بالِ جبریل

رفاقت علی شاہد

اگر ہم غزل میں اقبال کے رجحانات کا مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے آغاز میں اپنے استاد داغ کی پیروی کی۔ معاملاتِ عشق کو باندھنے میں داغ کو کمال حاصل تھا۔ اقبال کا ان اثرات سے بچنا ممکن نہ تھا۔ اقبال نے شاعری کی ابتداء کی تو اس وقت اُردو غزل کی روایت بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ اقبال نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں شاعری شروع کی۔ اس وقت غزل کے میدان میں نہ صرف داغ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا بلکہ امیر مینائی، جلال لکھنوی، ظہیر دہلوی، محسن کاکوروی اور پنجاب میں ارشد گورگانی بھی اس دور میں اُردو غزل کی روایت کے پاسبان تھے۔ ان حالات میں اقبال کی اولیّں غزلیں اسی روایتی رنگ کی حامل ہیں۔

۱۹۰۱ء میں مخزن جاری ہوا تو اقبال نے پُرانی روایت میں تجدد کی سعی کی اور مخزن کے ذریعے نظم نگاری کی طرف رجوع کیا تو اس سے ان کی غزل بھی متاثر ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں جب "بانگِ درا" منظرِ عام پر آئی تو اس میں اقبال مختلف نوعیت کے شاعر نظر آئے ہیں۔ وہ داغ سے علاحدہ اپنی ایک الگ روایت ترتیب دے چکے تھے، تاہم "بانگِ درا" میں قدیم طرز کی غزلیات کے نقوش بھی موجود ہیں کیونکہ یہ ان کا تاریخی ورثہ تھا۔

قدیم روایت سے الگ راستہ بنانے کے باوجود اقبال اس روایت سے یکسر منہ نہیں موڑ سکے۔ ان کے خیالات میں اس دور میں بھی انقلاب اور تنوّع ضرور تھا۔ لیکن شعر کی صورت گری میں اس رنگ کا استعمال ان کے لیے ناممکن نہیں تھا چنانچہ اقبال کی دورِ اوّل کی شاعری کی غزلیں قدیم روایت اور روایتی مضامین سے ہم آہنگ ہیں۔ اور بعد کی غزلیں ظاہراً رنگِ قدیم کی پیروی کو ظاہر کرتی ہیں، لیکن ان میں اقبال کے جدید خیالات کا بسیرا ہے۔ اسی لیے اقبال کی قدیم رنگِ سخن کے ساتھ وابستگی کو ظاہر کرنے کے لیے بالِ جبریل کی غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے کہ یہ اقبال کے اس دور کی یادگار ہیں جب ان کا تمام کلام پختہ فکری کے محاسن سے پُر اور نئی روایت کا پرتو تھا۔ اس سے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ اقبال نے اپنی الگ راہ بنانے کے باوجود پرانی روشنی کو کس قدر اور کس طرح استعمال کیا ہے۔

"بالِ جبریل" کا تقریباً نصف حصّہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان غزلیات میں اقبال کا منفرد طرز بہ تمام کمال موجود ہے۔ البتہ بعض جگہ اندازِ بیان میں اُردو غزل کی روایت کی پاسداری نظر آتی ہے۔ بعض مقامات پر مضامین پُرانے نظر آتے ہیں لیکن اقبال نے اپنی فراست کو کام میں لاکر ان غزلوں کو اپنے خیالات کا ترجمان بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

نغمۂ نوبہار اگر مرے نصیب میں نہ ہو
اِس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

انداز اور بیان اگرچہ قدیم طرز کا حامل ہے لیکن اس میں فکر اقبال نمایاں ہے۔ وہ مردِ مسلماں کو دمِ نیم سوز سے تشبیہہ دے کر اُسے "طائرکِ بہار" بنانے کی آرزو کر رہے ہیں۔ اگر اُردو غزل کی روایت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس شعر سے وہی گل و بلبل کا مضمون برآمد کیا جاسکتا ہے جو اکثر شعرائے متقدمین استعمال کرتے آئے ہیں۔ تاباں کہتے ہیں:

قفس میں تڑپے ہیں یہ عندلیباں سخت بے بس ہیں
نہ گلشن دیکھ سکتے ہیں نہ اب یہ آشیاں اپنا

ذیل میں ہم اُردو غزل کے روایتی مضامین سے چند کو منتخب کر کے دیکھتے ہیں کہ قدیم شعرا نے ان مضامین کو باندھ کر کیا معانی نکالے ہیں، اور اقبال نے اس میں کیا تجدد کیا ہے۔

عشق کا مضمون قدیم شعرا کے ہاں جس قدر کثرت سے استعمال ہوا ہے اُس نے اسے متنوع بھی بنا دیا ہے اور پامال بھی۔ میر و سودا اور درد نے عشق کو روحانی مسرت کا وسیلہ بنایا۔ انشا، جرات اور ان کے ہم عصروں نے عشق کے خارجی اور جسمانی پہلو پر زیادہ زور دیا۔ اس سے عشق کے پاکیزہ جذبے کو زبردست ٹھیس پہنچی۔ اس لیے دلی کے شعراء کے ہاں عشق ایک پاکیزہ جذبہ رہا، اور دبستانِ لکھنؤ کے زیرِ اثر شعرا کے ہاں لذت پرستی کا ذریعہ۔ چند قدیم شعرا کا عشق کے متعلق رویہ دیکھتے چلیے:

عشق ہے اختیار کا دشمن
ہوش صبر و قرار کا دشمن

(آبرو)

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

(سودا)

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

(میر)

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا غم سے آشنائی کی

(مرزا شوق)

اقبال کا عشق کا تصور ان سب سے جدا ہے۔ انھوں نے فلسفے کے اسرار کھولے تو عشق کی ایک نئی تعبیر سامنے آئی۔ ان کے نزدیک عشق محض ایک جذبے کا نام نہیں۔ یہ ایک جہدِ مسلسل ہے جس سے انسان مردِ مومن بنتا ہے۔ خام، پختہ ہوتا ہے اور زندگی اپنے مقصد سے آشنا ہوتی ہے۔ اقبال مردِ مومن کے لیے عشق کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کا عشق انسانی انا کو بلند اور خودی کو مہمیز کرتا ہے۔ اس میں صداقت، امانت، دیانت، اور مقصدیت ہے۔ بالِ جبریل کی غزلوں میں اقبال کے ہاں عشق کی مختلف قسم

کی رونمائیاں یوں ہیں:

وہ عشق جس کی شمع بجھادے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا
عشق کی اک جست نے طے کردیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگ یا شرف، مرگِ حیاتِ بے شرف

اردو غزل کی قدیم روایت میں دل کو کاروانِ وجود کا راہنما، رازہائے نہاں کی آماجگاہ، عقل کا دشمن، عاشق کی بربادی کا ذمہ دار اور معشوق کے طرف دار کے روپ میں پیش کیا گیا۔

اقبال نے زندگی کو عمل کی توسیع اور موت کو عارضی مقام دیا تو غزل کی کایا پلٹ گئی۔ چنانچہ اقبال کا امتیاز یہ نہیں کہ اُنھوں نے غزل کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل کو تجدد آشنا کیا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال نے عشق کے روایتی مضمون کو یکسر تبدیل کر دیا..... دل اسی عشق و محبت کی پیدائش کا مقام ہے۔ عشق جو تقدیریں بدل سکتا ہے۔ خودشناس بھی ہے اور رمزشناس بھی، جو ایک جذبے سے بڑھ کر قوت بن جاتا ہے، جہانِ نو کی تعبیر کرسکتا ہے۔ عشق کی اسی بامقصد قوت کا منبع دل ہے یہ قدیم شاعروں کے ہاں جس انداز میں استعمال ہوتا رہا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

دل غم سے کر کے لو ہو، لوہو کا کر کے پانی
آنکھوں سستی بہایا تب آبرو کہایا

(آبرو)

نہیں کچھ غم کہ کیوں ملتا نہیں پیماں گسل میرا
میں روتا ہوں یہ دل کی بے کسی پر ہائے دل میرا

(مظہر)

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

(میر)

وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

(صحفی)

اب دل سے متعلق اقبال جو کچھ کہتے ہیں اسے بھی دیکھیے:۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم، سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لیے ہے یہ نیستاں کے لیے

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

درد و سوز و غم، اُردو غزل کی روایت کا توانا ستون ہے۔ میر نے اسے معراجِ کمال عطا کیا، لیکن واضح رہے کہ اُردو غزل میں درد و سوزِ غم کا استعمال عشق و عاشقی کے جذباتی معاملات میں زیادہ ہوا ہے۔ غمِ جاناں و غمِ دوراں درد کے اظہار کے سطحی وسیلے ہیں چنانچہ اُردو غزل کی روایت میں درد و سوز و غم سے کوئی تعمیری کام نہیں لیا گیا اسے محض ایک کیفیت کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ چند اشعار بطور مثال درج کیے جاتے ہیں۔

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشمِ تر سے مینھ نہ برساتی

(مرزا مظہر)

ستم میں غم میں سرانجام اس کا کیا کہیے
ہزاروں حسرتیں تھیں جس پہ دل کو مار رہا

(میر)

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

(میر)

نالہ و آہ کیجیے، خونِ جگر ہی پیجیے
عہدِ شباب کہتے ہیں، موسمِ ناؤ نوش ہے

(درد)

ٹکڑے کب غم نے یہ جگر نہ کیا
نہ کیا نالہ ہم نے پر نہ کیا

(قائم)

اقبال نے دوسرے جذبوں کی طرح درد و سوز و غم سے بھی تعمیری کام لیا ہے اور تخریب کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ اسے محبت اور عشق کا نتیجہ تو قرار دیا ہے لیکن ایک جذبے سے بلند کر کے اسے ایک محرک بنا دیا ہے۔ خود شناسائی کا محرک، نگہ بلند پیدا کرنے کا محرک، عشق جہاں سوز کا محرک، خود داری کے حصول کا محرک۔ یوں "بالِ جبریل" کی غزلیات میں یہ درد و غم و سوز اپنے انوکھے زاویے دکھاتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:۔

وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اوّل سوز و تب تاب آخر

اب دیکھیے کہ درد و سوز و غم کا مقام بھی دل ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کو معراجِ کمال تک پہنچانے کا سبب سوز و درد و غم ہے۔ عشق، انسان کی خود شناسی اور معراج کا اعجاز ہے۔ عشق کا واسطہ براہِ راست دل سے ہے اور دل، سوز کی آماجگاہ۔ پھر عشق میں اس وقت تک خود شناسی اور معراج کا اعجاز پیدا نہیں ہوتا جب تک درد و سوز و غم اسے مہمیز نہ کرے۔ اس طرح اقبال کے نزدیک سوز، جسدِ خاکی میں روح کی مانند ہے۔ اُردو غزل اس معنی آفرینی اور تعمیری اندازِ فکر سے تہی نظر آتی ہے۔

یہ وہ چند خصوصیات ہیں جو پہلے اُردو غزل کی روایت کا حصّہ نہیں تھیں۔ اقبال نے اُردو غزل کے ان ہر دل عزیز مضامین کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ان میں مذکورہ خصوصیات کا اضافہ کر دیا۔ یوں انھوں نے نہ صرف غزل کو نئی روایت عطا کی بلکہ اس کی معنوی جہت بھی تبدیل کر دی۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں "بالِ جبریل" وہ مقام ہے جہاں وہ خالقِ کائنات سے بات کرتے ہیں تو بندۂ خاکی کو نہیں بھولتے۔ "بالِ جبریل" کی غزل ایک انقلاب آفریں پیکر ہے جو غزل کے مستقبل کو نئے خطوط اور نئے معنوی خدوخال دیتا ہے۔

قومی زبان (۳۱) نومبر ۱۹۹۴ء

اقبال کی شاعرانہ عظمت

نیلم سیّد

اقبال کی شاعری کا طلوع اس صدی کے طلوع کے ساتھ ہوا۔ سر عبد القادر کے ادبی رسالے مخزن کا اغاز ۱۹۰۱ء سے ہوا جس میں اقبال کی اُردو نظمیں مثلاً کوہِ ہمالہ وغیرہ جو منظریہ شاعری کی نقیب تھیں شائع ہوئیں لیکن شاعری میں خارجیت کا یہ میلان جو منظر نگاری کی شکل میں اقبال کے ہاں دکھائی دیتا ہے اس کے ابتدائی آثار آزاد، حالی اور ان کے دوسرے ہمعصروں کے ہاں دکھائی دیتے ہیں پچھلی صدی کے ربع آخر کے آغاز میں یعنی ۱۸۷۴ء میں آزاد اور حالی نے مل کر کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے جدید شاعری کا پہلا مشاعرہ برپا کیا۔ اس مشاعرے میں شاعری کی پرانی روایت میں کئی تبدیلیاں آئیں غزل کی بجائے نظم کو توجہ کا مرکز بنایا گیا اور انگریزی میں منظریہ شاعری کی تقلید میں بہار، خزاں، صبح، شام، برکھارُت اور اسی قسم کے موضوعات پر مسلسل نظمیں لکھی گئیں۔

تاہم اقبال کی شاعری کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد کی سرسیّد اور اس کے رفقا کی ادب و معاشرت اور تعلیم کی اصلاح کی تحریک کو پیشِ نظر رکھنا ناگزیر ہوگا۔ سرسیّد، حالی، آزاد، شبلی اور نذیر احمد نے شعر و ادب کو گردوپیش کی زندگی کا ترجمان بنایا۔ زبان و ادب کا رشتہ پرانی داستانوں کے ماورائی ماحول سے کٹ گیا، نئی تہذیب نئی تعلیم اور نئی معاشرت کے گونا گوں مسائل اور ان کے حل کے لیے زبان و ادب کو وقف کر دیا گیا۔ اردو زبان و ادب سے سائنسی افکار، فلسفیانہ خیالات، مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ گردوپیش کی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی کا کام لیا گیا۔

اقبال کی شاعری اسی پس منظر میں لکھی گئی۔ اس نے اپنے ماقبل تاریخی عہد کی روایات سے غذا حاصل کی اور شعر و ادب میں اصلاحی تحریک کی جو داغ بیل ڈالی گئی تھی اقبال نے اسے اپنے عہد میں پروان چڑھایا۔ تاہم اقبال نے ماضی کے ورثے کی اندھی تقلید نہیں کی۔ اس نے ماضی کے ورثے کے احترام کے باوجود اسے اجتہادی نقطۂ نظر سے جانچا، پرکھا اور پھر اس کے جاندار اور ترقی پذیر اجزا کو نئی زندگی دی۔ اقبال کے تخلیقی تجربے اور اس کے تخلیقی شعور نے شاعری کے محدود کینوس کو لامحدود کر دیا۔ یہ پھیلاؤ اسی ذات کا وسیع پھیلاؤ تھا۔ اقبال کی عظیم شخصیت مشرق و مغرب کے علمی دھاروں کا ایک سنگم تھی اس نے ایک طرف تو رومی، حافظ، غالب، نذیری، بیدل، عطار اور سنائی جیسے شعرا سے استفادہ کیا ساتھ ہی مشرق کے مشاہیرِ فلسفہ و فکر امام غزالی، ابن خلدون، فارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ، محمود شبستری، ابنِ عربی اور مجدّد الف ثانی جیسے صوفیا سے فکری غذا حاصل کی۔ اور دوسری طرف مغرب کے عظیم مفکروں نیٹشے، برگساں، کانٹ، ہیگل اور نیٹشے وغیرہ سے اخذ و استفادہ کیا۔

مشرق و مغرب کے سر چشموں سے سیرابی اقبال کے فکر و فن کو عظمت دے گئی اُس نے فلسفیانہ افکار کو شعری زبان دی۔ اس کے تخیل نے مطالعۂ تاریخ سے فائدہ اٹھا کر اس کے اسلوبِ بیان کو تاریخی اور تلمیحی بنا دیا۔ شعر ملاحظہ ہو۔

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر
اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے ہمہ جہتی مطالعے نے اس کی شاعری کو فلسفہ، سیاست، مذہب، اخلاق، تاریخ اور تہذیب کے گوناگوں خیالات سے مالا مال کیا اور لطف یہ کہ ان متنوع خیالات و افکار نے اقبال کی شاعری کی آگ کو بجھنے نہیں دیا۔

اقبال کی شاعری اس کے اجتماعی نصب العین کے زیرِ اثر ہے زبان و بیان کا بے مقصد استعمال اس کے ہاں کہیں نہیں ہے اس کی شاعری نے جس مقصد کو مکمل کیا وہ قومی اور ملی نصب العین ہے۔ اقبال ایک جگہ لکھتا ہے۔

"میں اپنی شاعری سے وسط ایشیا کے دل پر جمی ہوئی پپڑی کو توڑنا چاہتا ہوں"

یہ بات اقبال کے مقصدی نصب العین کو ظاہر کرتی ہے اقبال نے اپنی شاعری سے ملّت کی نشاۃِ ثانیہ کا کام لیا اس نے جمود زدہ، زوال پذیر، تقدیر پرست اور عملی اعتبار سے مفلوج اور معطل قوم کو عزم و ثبات سے جینے کا درس دیا۔ بے روح تصوف اور انکارِ ذات کے فلسفے نے جس قومی زندگی کو شل کر دیا تھا اسے اُس نے نئی جولانی اور روانی عطا کی خودی کے درس سے اس نے اپنے عہد کی قومی نسلوں کو ان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا سراغ دیا۔ ترکِ دنیا اور رہبانیت کے اصولوں سے الگ کر کے پوری قوم کو حرارت و حیات سے ہمکنار کیا۔ یہ سارا کام اقبال نے اپنی عظیم شاعری سے لیا۔

اقبال کی شاعری استعاروں اور علامتوں کا اپنا ایک نظام رکھتی ہے ہر عظیم شاعر اپنے تخلیق کردہ اسی علامتی نظام سے پہچانا جاتا ہے اقبال کی علامتیں اور اس کے استعارے اس کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کا پتہ دیتی ہیں اقبال کی نئی علامتیں اور استعارے اس کے اصلی کلچر اور تمدن کے اندر سے اُبھرتے ہیں علاوہ ازیں یہ علامتیں ماضی کی صحت مند روایات سے بھی اپنا ایک رشتہ رکھتی ہیں اقبال کا ناقدانہ وژن، علامتوں کے نئے اور پرانے ذخیروں سے موزوں بر محل، موثر اور بلیغ علامتوں کو چھانٹنے اور انھیں پھر اپنے شعری اسلوب میں کھپانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اسی خصوصیت کو عابد علی عابد نے اپنی کتاب "شعرِ اقبال" میں مطابقتِ الفاظ و معانی کا نام دیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال کے ہاں الفاظ و معنی کی کیسی نفیس و جمیل مطابقت ہے اور وہ کیسے وسیع سلسلۂ خیال کو نہایتِ مختصر لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔

اگر نہ بوالہوسی باتو نکتہ گویم
کہ عشق پختہ تراز نالہ ہائے بے اثر است

اس شعر کے الفاظ پر غور کیجیے تو ایک جہانِ معنی پوشیدہ نظر آئے گا اقبال فطرت کے حسن زاروں سے جن علامتوں کو منتخب کرتا ہے ان میں لالۂ صحرا، لالہ تارا یا صبح کا تارا، شہباز، شاہین جگنو، پروانہ، شمع وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں جو کہ اقبال کی اپنی ذات اور مردِ آزاد کی علامت ہیں۔ اور آئیڈل سوسائٹی کے فرد کو شہباز اور شاہین کا لقب بھی دیا ہے اقبال اپنے مظہرِ قوت سے بلبل، قمری اور کبوتر کی بجائے شاہین اور باز کو زیادہ پسند کرتے ہیں وہ کافری، دینداری، ملت بیضا، توحید، حرم، جہاد، یدِ بیضا، جمال، جلال، نور، کلیم،

خلیل، معجزہ، جیسی مذہبی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں تو جنگ زرگری، جمہوری، نظام اشتراکیت، دہریت، نغمہ بیداری، مجلس آئین جیسی سیاسی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں اسی لیے فلسفیانہ اصطلاحات سے بھی ان کا کلام مزین ہے۔ مثلاً عینِ ذات، ذاتِ حق، ثبات بقا، مقام کبریا، معرکہ بود و غرور وغیرہ۔ ان کے ہاں تلمیحات بھی جا بجا ملتی ہیں مثلا،

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

تشبیہات کی قدرت و ندرت کلام میں غیر معمولی حسن و جمال پیدا کر دیتی ہے اور اقبال کی شاعری میں اچھوتی اور نادر تشبیہات کا استعمال شروع سے ملتا ہے چنانچہ ان کے پہلے دور کی نظموں میں "جگنو" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں ان کی استعمال کردہ تشبیہات کی ندرت کا کمال اپنے عروج پر ہے۔ مثلاً

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

اقبال کی تشبیہات محسوسات کے قریب ہیں مثلاً

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

اقبال متحرک تشبیہات کے ذریعے غیر ذی روح چیز میں جان پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اپنی نظم "بزم انجم" میں اسی قسم کی متعدد تشبیہوں سے سماں باندھا ہے۔

اقبال کے استعارے بھی ان کے شاعرانہ بیان کی ایک اہم خصوصیت ہیں اس خوبی کے بغیر شاعری میں ایجاز و اختصار کی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی۔

اقبال کی شاعری میں رومانیت اور رمزیت کے عناصر خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں یہ دونوں شعری عناصر مشرقی ادب کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ اور اقبال کی شاعری کا کمال اس کی رمزیت اور کنائے میں پوشیدہ ہے اقبال نے اپنی نظم "شمع اور شاعر" میں ایمائی کیفیت کا کمال دکھایا ہے اقبال کی ایک اور نظم "مسجدِ قرطبہ" جدید اردو ادب کا شاہکار ہے اس میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے اس میں اقبال تفصیل سے ہسپانیہ کی اسلامی عہد کی تاریخ بیان نہیں کرتا بلکہ صرف چند اشارے کرتا ہے لیکن یہ چند اشارے ضخیم تاریخوں پر بھاری ہیں۔

اقبال کے ہاں شاعرانہ تصویر کشی (امیجری) کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ان کی نظموں "آرزو" اور "کشمیر" میں خوبصورت تصویر کشی ملتی ہے ان کے فارسی کلام میں بھی تصویر کشی کے نادر مرقعے ملتے ہیں۔ تصویر کشی ان کے ہاں بعض اوقات کسی خاص تفکر یا موڈ کے تابع ہو کر بھی آتی ہے وہ اس کے ذریعے صرف کائنات کی امیجری محض حسن آفرینی کے لیے پیش نہیں کرتے بلکہ انکشافِ حقیقت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

اقبال کے کلام کے یہ مصرعے ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
فیلِ بے زنجیر کی مانند اڑا جاتا ہے ابر
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

اقبال ڈرامائی انداز کی طرف بھی مائل نظر آتے ہیں "جاوید نامہ" ایک ڈرامائی نظم ہے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

"اقبال کا اصلی فنکارانہ کمال ان کی شاعری کے ڈرامائی رنگ میں ظاہر ہوا ہے جو ان کے غزلیہ رنگ یا تغزل کے پہلو بے پہلو چل رہا ہے"

اقبال کے موضوعات محض حسن و عشق کے نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں مختلف موضوعات ملتے ہیں جیسے "والدہ مرحوم کی یاد میں" دردو اثر اور فلسفہ و حکمت کا ایک عظیم خزانہ ہے۔ "خضرِ راہ" حکمت و عمل، دردواثر عظمت وخود آشنائی کا ایک مخزن ہے "طلوعِ اسلام" اُمید کی روشن کرن ہے جس کی تابانی مایوس دلوں کو منور کرتی ہے اور منزل نو کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ بالِ جبریل کی بے شمار غزلیں فن کا نادر نمونہ ہیں اور مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، اور ذوق و شوق کا جواب اردو شاعری میں نہیں ہے اقبال نے اپنے فن کی تمام رعنائیاں ان منظومات میں بے نقاب کر دی ہیں اور اپنے نغمے کی دل آویزی سے سحر خیزی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اقبال کے فن میں ان کا خونِ جگر یا دردِ دل جس قدر شامل ہے اس کی ایک جھلک "ارمغانِ حجاز" کی صورت میں مشاہدہ کی جاسکتی ہے، بیان میں شوخیِ گفتار کے نمونے بھی میسّر آتے ہیں جو "شکوہ" سے کسی طرح کم نہیں اور یہ تمام شوخیِ فکر کی رعنائی اور نیاز کی نازکیشی کا نتیجہ ہے۔

اقبال کے عہد میں فن برائے فن اور فن برائے زندگی کا نظریہ بھی زیرِ بحث رہا لیکن اقبال نے فن برائے فن کو رد کر کے فن برائے زندگی کے نظریے کو اپنایا اور اپنے فنِ شاعری سے صورِ اسرافیل کا کام لیا۔

اقبال کی شاعری چونکہ معاشرتی اور قومی اصلاح کے مقصد کو پورا کرتی ہے اس لیے اس کا اسلوبِ بیان خطیبانہ اور دعوتِ عمل دینے والا ہے۔ خطیبانہ اسلوب قاری کو ترغیبِ عمل دیتا ہے۔ ترغیبِ عمل کا یہ جوہر اقبال کی شاعری کا ایک بڑا ہی نمایاں پہلو ہے ملتِ اسلامیہ کے جمود زدہ اور عملی لحاظ سے مفلوج قافلے کے قدموں کو روانی اور جولانی دینا چاہتا ہے اور اسی لیے جگہ جگہ حرکت اور حرارت کے لیے ایک ترغیب یا دعوت دکھائی دیتی ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری سے، شاعری کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا۔ مشرق و مغرب کی علمی شخصیتوں، فکر و فن کے مختلف دبستانوں، سیاسی و مذہبی تحریکوں سے استفادہ کرتے ہوئے اس نے اپنے شاعرانہ تجربے اور اپنی قلبی واردات کو نہایت ہی مالا مال کر لیا اور پھر اس عظیم داخلی واردات اور عظیم تجربے کے اظہار و ابلاغ کے لیے بے شمار خوبصورت ترکیبیں بھی تخلیق کیں۔ پرانی علامتوں اور استعاروں کو نئے معانی بھی پہنائے اور ساتھ ہی ساتھ نئی علامتوں کا ایک پورا نظام بھی تخلیق کیا جو صوتی لحاظ سے اور حسی پیکر تراشی کے اعتبار سے خوبصورت بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ اس کی شاعری حسنِ معانی، حسنِ صوت، حسنِ تصویر کاری کے ساتھ مل کر تخلیقی روپ کی ایسی نامیاتی وحدت کو جنم دیتا ہے کہ جس کی وجہ سے اقبال شعر و ادب کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ قدآور اور سرکشیدہ دکھائی دیتا ہے۔

قومی زبان (۳۵) نومبر ۱۹۹۴ء

سر شاہ محمد سلیمان
مبصّرِ ادب

مختار زمن

سر شاہ محمد سلیمان بڑے ہیرا آدمی تھے۔ وہ ایسے قانون داں تھے کہ غیر منقسم ہندوستان میں جب بڑے بڑوں سے ٹکر ہوتی تھی ان کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پہلے الہ آباد کورٹ کے چیف جسٹس بنے پھر دہلی سپریم کورٹ کے (جو اس وقت فیڈرل کورٹ کہلاتا تھا) جج نے حساب و سائنس میں ہاتھ ڈالا تو آئنسٹائن سے بھڑ گئے۔ مذاہب کا مطالعہ شروع کیا تو درجہ کمال کو پہنچا دیا۔ عبرانی پڑھنی شروع کی اور اس کام کے لیے ایک عبرانی داں کو ملازم رکھا تو اس میں آگے بڑھ گئے۔ وہ دراصل کلام مجید پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی پچھلی صدی کے آخری برسوں میں جونپور (یوپی) میں پیدا ہونے والا یہ شخص پاکستان سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہوگیا ..... میں جب پڑھتا تھا تو انھیں ہائی کورٹ میں دیکھا اور ان کی تقریر "اتحاد کائنات" (FATHOMLESS UNIVERSE) یونیورسٹی میں سنی ..... بوٹا سا قد بہت گورا رنگ، بالکل سفید ترشے ہوئے بال، سنتوان ناک اور بے حد چمکیلی آنکھیں، آواز نہ بھاری نہ باریک مگر بلا کی موثر ایک قابل توجہ بات یہ تھی کہ وہ نچلا بیٹھنا نہ جانتے تھے، ہر وقت بے چین، جلد جلد کام نمٹانے میں یدِ طولیٰ، ہائیکورٹ میں کرسیِ عدالت پر بیٹھے تو بار بار آستین ٹھیک کرتے، سر پر ہاتھ پھیرتے پہلو بدلتے۔ گویا رگوں میں پارہ بھرا ہوا تھا۔

ان کے منجھلے بیٹے شاہ محمود سلیمان سے جو اب امریکہ میں رہتے ہیں میری گہری دوستی ہے (سب سے بڑے احمد اور سب سے چھوٹے حامد ہیں) یوں تو سلیمان خاندان کی عادت ہے کہ وہ گھر والوں کا ذکر کم کرتے ہیں مگر کرید کرید کر پوچھو تو بات بتا دیتے ہیں۔ محمود کہتے تھے کہ ابا جان دن بھر کام کرتے ہیں۔ شام کو دوستوں سے ملتے ہیں، جاڑے میں تو کافی ورنہ ٹھنڈے شربت سے تواضع کرتے ہیں اور پھر جو وہ کھانا کھا کر سائنس و ادب کے ساتھ وقت گزارنا شروع کرتے تو رات کے دو بج جاتے ہیں ..... جب ادب کی طرف انھوں نے توجہ کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہی ان کا پیشہ ہے۔ مگر پہلے چند الفاظ پس منظر کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ ان کا ماحول بھی دین کے کردار و ساخت میں اکثر اہم کردار ادا کرتا ہے سر شاہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس پر اسلامی تہذیب، اعلیٰ اقدار اور علم و ادب کی چھاپ بہت نمایاں تھی۔ ان کے جد امجد مخدوم عیسیٰ شاہانِ شرقی کے زمانے میں دہلی سے آکر جونپور میں بس گئے تھے۔ سر شاہ کے **والد مولوی شاہ محمد** عثمان جونپور کے چوٹی کے وکیل تھے۔ درس نظامیہ فلسفہ و منطق

اور مشرقی علوم کی کتابیں مستند علما سے پڑھ چکے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور فدائی تخلص کرتے تھے۔

علامہ کیفی چڑیا کوٹی نے ان کے کلام پر دیباچہ و تبصرہ لکھا ہے۔ متقدمین میں خواجہ حافظ، مولانا جامی اور متاخرین میں علی حزیں کو پسند کرتے تھے۔ شاہ محمد عثمان حکیم مومن خاں کے کلام کو سراہتے تھے۔ سر سیّد کی محنت، سادگی اور مولانا حالی کی قوم پرستی سے متاثر تھے علامہ کیفی لکھتے ہیں "خاندانی ذکاوت اور ذاتی ذہن کے ساتھ فضل و کمال اس پر منطق کی حجت آفرینی اور فلسفے کی نظر عمیق نے وکالت کو ایسا موج طوفان بنا دیا جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہرنے کی تاب نہ لاسکتی تھی۔ مولوی عثمان صاحب بڑے متواضع، سیر چشم، اقربا پرور، دوست پرست اور سخی تھے" ..... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی صاحب بھی کوئی معمولی انسان نہ تھے اور یہی وہ گھرانا اور ماحول تھا جس میں سر شاہ نے آنکھ کھولی تھی ..... پھر اس پر طرہ یہ کہ خود سر شاہ سلیمان حقیقتاً نابغۂ روزگار یعنی جینیس تھے۔ "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" پیدائشی طور پر ان کا ذہن بجلی کی تیزی، سورج کی چمک اور تلوار کی کاٹ رکھتا تھا۔ اوپر سے شاہ محمد عثمان جیسے نیک سیرت اور لائق بزرگ کی تربیت ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کردار پر صیقل اور طبیعت پر جلا ہوگئی۔ قانون تو گھر کی بات تھی اردو فارسی علم و ادب بھی گھر کی لونڈی بن گیا شعر و ادب کے پرکھنے کا شعور پیدا ہوگیا اور لطف یہ کہ بے انتہا پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے باوجود وہ ساری عمر علم و ادب سے دلچسپی لیتے رہے ..... یہ بڑے لوگ بھی غضب کرتے ہیں انھیں وقت کی شکایت بہت کم ہوتی ہے۔ ہم جیسے نادان، ہیچمداں کام نہ کرنے کے سیکڑوں بہانے ڈھونڈ لاتے ہیں۔ دفتر میں کام بہت ہے۔ بچوں کو سینما لے جانا ہے۔ بیوی کو کپڑے دلانا ہیں وغیرہ چاہے بیشتر وقت گپ مارنے، چاء پینے یا بیٹھے بیٹھے پاؤں ہلانے ہی میں گزرے لیکن وقت کی کمی کا شکوہ ایک مستقل بہانہ ہے۔ سر شاہ تفریح کرنے شاذ و نادر ہی جاتے تھے ان کے سالے شاہ جمیل عالم مرحوم کہتے تھے کہ ایک دفعہ لیڈی سلیمان کے کہنے سے وہ کشتی رانی کی تفریح میں حصّہ لینے گئے۔ دریا کی روانی آگے پیچھے دوڑتے بادلوں کے حسن اور سردیوں کی گلابی دھوپ سے تو لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن احتیاطاً ایک کتاب بھی ساتھ رکھ لی تھی اور جب پراٹھے قیمہ کھا کر لوگ سستا رہے تھے تو انھوں نے وہ کتاب پڑھنا شروع کی اور گھر آتے آتے معلوم ہوا کہ ڈیڑھ سو، دو سو صفحے کی کتاب ختم کر ڈالی اب جب دہلی میں تھے تو لوگ اتوار مناتے تھے۔ وہ سنیچر کی شام کو علی گڑھ آتے۔ اتوار کو بطورِ وائس چانسلر کام کرتے اور سوموار کو پھر عدالت میں موجود مطلب یہ ہے کہ بڑے لوگ زندگی کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اور یہی حال سر شاہ کا تھا ..... جہاں تک میرا علم ہے کہ سر شاہ محمد سلیمان نے اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں چھوڑی لیکن میر تقی میر کی مثنویاں اور ذوق کے کلام کو ایڈٹ اور مرتب کیا۔ دونوں کتابوں پر بھرپور دیباچے لکھے تبصرہ سے مزین کیا اور شایع کیا۔ انھیں پڑھ کر معلوم ہوتا کہ اردو ادب و شاعری کے بارے میں سر شاہ کا علم و فن اور شعر گوئی پر ان کی نظر کتنی گہری تھی ..... انھوں نے میر کی مثنویوں کے انتخاب کے دو معاملات بیان کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میر نے بعض ایسے قصّے نظم کیے ہیں جن میں فحش اشعار یا مضامین پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے میر کے زمانے میں یہ بات معیوب نہ ہو مگر سر شاہ کے زمانے میں تھی۔ لہذا "مناسب خیال کیا گیا کہ اکثر اشعار اس طرح پر چھوڑ دیے جائیں کہ مثنوی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے اور اصل قصے کی صورت بھی بدلی ہوئی نہ معلوم ہو" ..... یاد کیجیے کہ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کے بعض اشعار میں بھی نقطے لگا دیے گئے اس لیے کہ بعض دفعہ وہ بھی ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو ابتذال کے زمرے میں آتے ہیں مگر اس سے نظیر کی عظمت اور شاعرانہ صلاحیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ..... شاہ صاحب کہتے ہیں کہ مسئلہ یہ ہے کہ میر کا کلام بہت کثیر ہے۔ کلام میں رُطب و یابس سب کچھ ہے۔ سر شاہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اصول انتخاب یہ ہے کہ "صرف اُن اشعار کو نقل کیا جائے جو فنِ شاعری کے نقطۂ نظر سے قابل

قدر ہیں" اس لیے انھوں نے بھرتی کے اور پھیکے اشعار کو نکال دیا میر تقی میر مانا ہوا شاعر ہے جو اوّلین صف میں کھڑا نظر آتا ہے اس کے کلام کا جواب نہیں مگر رطب و یابس اور بھرتی کے اشعار اس کے یہاں بھی بہ کثرت ہیں ..... سر شاہ نے انتخاب کا جو اصول بیان کیا وہ ان کے گھرانے کی اعلیٰ تربیت کی بھی نشان دہی کرتا ہے اور ان کے اپنے مذاق کا بھی تعین کرتا ہے۔ ان کا مذاق ستھرا اور ان کے ماحول کے مطابق تھا جو ابتذال کو پاس نہ پھٹکنے دیتا تھا میر کے کلام پر ۳۶ صفحات کا تبصرہ لکھنے کے لیے شاہ صاحب نے تقریباً بیس بائیس اردو کتابوں اور تذکروں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان میں آزاد کی آبِ حیات، میر کا "ذکر میر و نکات الشعراء" قایم چاند پوری کا "مخزن نکات" نساخ کی "سخن شعرا" اور مصطفٰے خاں شیفتہ کے "گلشن بے خار" کے علاوہ نیرنگ خیال کا میر نمبر، مولوی عبدالحئی کا گل رعنا، مولوی عبدالحق کا انتخاب عبدالسلام ندوی کے شعر الہند جیسی جدید تصنیفات بھی شامل ہیں۔ مگر شاہ صاحب نے ایک جج کی ایمانداری کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ "اس دیباچے میں کسی جدّت یا نئی بات کے دریافت کرنے کا دعویٰ نہیں کیا گیا ..... چنانچہ حسب نسب، سال پیدائش و وفات تعلیم و تربیت وغیرہ پر مختلف تذکرہ نگاروں کی تحریروں کا حوالہ دے کر اپنی ذاتی رائے بیان کی ہے۔ محمد حسین آزاد نے جو قصّے بیان کیے ہیں بعض تذکرہ نویس اُنھیں صحیح مانتے ہیں۔ بعض اُن سے انکار کرتے ہیں۔ سر شاہ نے بھی ان تمام کوائف کا ذکر کیا ہے ..... انھیں اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کہ میر نے تنگی تُرشی سے زندگی بسر کی بلکہ اس نے اخیر میں تو گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور بقول آزاد "فقر و فاقہ سے گزارہ کرتے تھے" سر شاہ محمد سلیمان نے اس بات کی تائید میر کے کلام میں ڈھونڈی ہے۔ درد آمیز مضامین مایوسانہ خیالات، رونا دھونا میر کے اشعار میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ جو ہجو انھوں نے اپنے مکان کی کہی ہے وہ بھی ان کی سراپا غربت کا نمونہ ہے۔ جو اشعار اپنے متعلق لکھے ہیں ان سے تلخ زندگی بسر کرنے کی شہادت ملتی ہے۔ مثلاً

ایک محروم چلے میر تمھیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

میر کا انداز طبیعت ان کے کلام پر کس طرح اثر انداز ہوا؟ اس نکتے پر سر شاہ نے ایک وکیل کی چابک دستی سے بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں میر کے مزاج میں اس قدر تکبر تھا کہ خوشامد کرنا جو اُس وقت آداب درباری میں داخل تھا، اُن کو گوارا نہ تھا۔ دوم میر کو قصیدہ گوئی پر اعلیٰ پیمانے کی قدرت نہ تھی اور وہ شوکت الفاظ جو دربار کے لیے زیبا ہے ان کی مایوسانہ طبیعت اور غم زدہ پست ہمتی ان کے لیے مہیّا نہ کرنے دیتی تھی ..... قصائد پر قادر الکلامی درباری ترقی کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سودا کی آؤ بھگت دربار میں بمقابلہ میر کے زیادہ ہوئی ..... "سر شاہ سلیمان لکھتے ہیں کہ" میر کے لیے ایک خاص دِقت یہ پیدا ہوئی کہ ان کی لکھنؤ کی آمد سے پہلے سودا کا زمانہ ابھی گزرا تھا اور ان کے آخر زمانے میں انشاء ایسا برجستہ گو، شوخ اور حاضر جواب شاعر پیدا ہوا، گو فن شاعری میں میر کو اس سے کوئی نسبت نہ تھی یہ شستہ زبان اور چٹکڑپن کا مقابلہ تھا۔ پھر بھی اس کا طرز نواب کو پسند خاطر تھا۔ جس نے دربار پر اپنا سکّہ جمالیا صرف درد آمیز اور غمزدہ کلام، ہمیشہ کا رونا، جو میر کا خاصّہ تھا درباری شان کے لیے موزوں نہ تھا اس لیے تعجب کی بات نہیں کہ میر شکستہ دل ہو کر دربار سے گریز کرنے لگے" .....

بعض باتیں جو سر شاہ محمد سلیمان نے بیان کی ہیں صاف و صریح حقیقتیں ہیں بلکہ خوشامد تو آج بھی آدابِ درباری میں داخل ہے۔ شاہی دور کی طرح آج بھی وی۔ وی۔ آئی۔ پی ہوتے ہیں۔ معمولی وڈیروں تک کے سامنے بھی کچھ لوگ ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ کہاں یہ باتیں اور کہاں خوددار قانع اور میر سا بے دماغ آدمی اور قصیدہ گوئی اور جو قصیدہ گوئی نہیں کر سکتا وہ دربار

سے فائدہ بھی نہیں اُٹھاسکتا۔ میر انشاء اللہ خاں انشا کی دربار میں کامیابی اور میر کا دربار سے کھچاؤ بجائے خود اُس معاشرے کی تصویر دکھاتا ہے۔ چرب زبانی اور خوشامد کی سیڑھی لگا کر بلند مقام پر پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ناک اونچی رکھنا اور اس پر مکھی نہ بیٹھنے دینا الگ بات ہے، موم کی ناک بن جانا کہ جدھر چاہو موڑلو الگ ہے۔ خودی اور خودداری مہنگا سودا ہے۔

جھکنے والوں نے رفعتیں پالیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے!

آخر زمانے میں میر خود بھی لکھنؤ سے تنگ آگئے تھے۔

متاع ہنر پھیر کر لے چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

سرشاہ محمد سلیمان نے میر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اشعار کو سہل ممتنع قرار دیا ہے۔ مثلاً

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

وہ لکھتے ہیں کہ اردو میں چھوٹی بحروں میں غزلیات کہنے میں میر کے ہم پلہ کوئی دوسرا شاعر اب تک نہ ہوا۔ قصیدہ مرزا سودا کا میدان ہے مگر غزل میں وہ میر کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ میر اُردو مثنویات کے بھی موجد ہیں میر حسن اور شوق کو انھیں کا مقلد سمجھنا چاہیے .....اس تحریر کو پڑھ کر میر کی ایک متوازن اور صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ غزل اور مثنوی میں اس کا جو مرتبہ ہے اس کا تعین ہوجاتا ہے۔ میر کی طبیعت و مزاج کے جو اثرات ان کے کلام اور زندگی پر پڑے وہ صاف نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں کتاب شایع ہوئی مگر تحریر کا توازن آج بھی قابل توجہ ہے۔

شیخ ابراہیم ذوق کے قصائد کا دیباچہ صرف ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۲۴ء میں شایع ہوچکا تھا دیباچہ کی تمہید قابلِ توجہ ہے۔ سرشاہ محمد سلیمان لکھتے ہیں شعرا ہمارے ادب و زبان کے پیش رو اور راہبر تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعے سے فخر قومی قایم رہتا ہے۔ اپنی تہذیب کے اعلیٰ پیمانوں کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ اسی خیال کو مدِ نظر رکھ کر میں نے یہ جرأت کی کہ استاد ذوق کی غزلیات کو چھوڑ کر قصائد و دیگر کلام کو از سر نو ترتیب دے کر شایع کروں تاکہ نوجوانان قوم کو، جو اکثر ادب اردو سے ناآشنا ہوتے ہیں یہ موقع ہاتھ آئے کہ اردو شاعری کے ایک مستند استاد کے کلام کو نئے لباس میں ملبوس دیکھ کر اس کے مطالعے کی طرف مائل ہوں اور اُس کی نازک خیالی، اور فصاحت و بلاغت سے لطف اُٹھائیں اور معلوم کریں کہ ہماری فراموش کردہ زبان میں بھی کیا کیا جوہر موجود ہیں۔

ذوق اپنے وقت کے اعلیٰ شاعر اور محمد حسین آزاد کے استاد تھے۔ آزاد نے اپنی کتاب "آبِ حیات" میں شاگردی کا حق بڑھ چڑھ کر ادا کیا ہے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ملک الشعراء کا سکّہ اس کے نام (یعنی ذوق کے نام) سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا وہ بلبل تھا وہ باغ برباد ہوگیا۔ نہ ہمعصر رہے نہ ہم داستان رہے" میں نے عرض کیا کہ آزاد نے استاد ذوق کے سلسلے میں حقِ شاگردی نبھایا ہے۔ مگر سرشاہ محمد سلیمان نے غلو سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے قصائد پر اپنی جامع رائے ظاہر کردی ہے۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ذوق نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے تھے "لیکن آزاد نے لکھا ہے

کہ ساڑھے تین سو دیوانِ اساتذۂ سلف کے دیکھے تھے۔ ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو.....

سر شاہ نے مبالغے کے بارے میں ایک پتے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں کہ قصائد میں مبالغہ کثیر ہے۔ اکثر استاد نیچرل شاعری کی حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ مگر بلا اس بات کے نظم بے نمک ہوتی ہے۔ ہر سخن فہم مبالغے کو خوب سمجھتا ہے اور مبالغہ آمیز تعریف کو کلیتاً سچ نہیں سمجھتا پھر کہتے ہیں کہ "مبالغہ ایک جامۂ زرّیں ہے جس میں اصل خیال آراستہ کیا جاتا ہے۔ غرض صرف اعلیٰ مشابہت سے ہے مبالغہ خوبیٔ کلام ہے نہ کہ نقص" .....

یہ ایک تیز طرار منصف مزاج جج کی رائے ہے اس لیے غور و خوص کی دعوت دیتی ہے۔ ہماری شاعری مبالغے سے بھری پڑی ہے۔ مگر کیا مبالغہ، ایک حد تک ہی سہی، جایز ہے؟ کیا مبالغہ زیور ہے جو گو حسن پیدا نہیں کرتا مگر اُسے سنوارتا اور بڑھاتا ضرور ہے۔ کیا یہ صحیح ہے:

اُسے کیا فکر زیور کی جسے خوبی خدا دیوے
کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کا گہنا

کیا "گہنا" کا لفظ محض زیور کے معنی میں استعمال ہوا اور فی الواقع شاعر زیور کے خلاف ہے یا اور چاند گرہن کا بھی کوئی دخل ہے اہلِ ذوق کے لیے یہ دلچسپ اور قابل توجہ مقام ہے کہ پورا شعر "گہنا" کے گرد گھومتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو خاقانیِ ہند کا خطاب دیا تھا۔ سر شاہ لکھتے ہیں کہ جو اعزاز بادشاہ نے اُن کو بخشا تھا وہ بلاوجہ نہ تھا۔ حقیقت میں استاد ذوق کو نہ صرف لقب بلکہ درجہ خاقانیِ ہند کا حاصل تھا۔ اور اس پر ان کی یہ خاکساری کا عالم۔

اے ذوق، کس کو چشم حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوی ہم سے کم نہیں

واقعہ یہ ہے کہ سر شاہ نے جو بات کہی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ قصیدہ خوانی بذاتِ خود کوئی اچھی بات نہ سہی لیکن قصیدہ گوئی ایک ایسا فن ہے جس میں طبیعت کی جولانی، الفاظ کی فراوانی، خیال کی نزاکت، بیان کی قوت سبھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ممدوح کی تعریف کے ساتھ ساتھ دراصل قصائد میں نعت، حمد، تشبیب، گریز، تغزل سبھی پہلوؤں پر جولانی قلم دکھانے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ یہ فن دھوم دھڑکا، شان و شوکت، اونچا سُر چاہتا ہے۔ یہ کوئی آہستہ خرام ندی نہیں بلکہ تند و تیز بل کھاتا، لہراتا شور مچاتا دریا ہے۔ اس میں فنکاروں کو بڑی آزمایش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک اچھے قصیدے میں خیال و زبان کے سو رنگ نظروں کے سامنے جھلکتے، جگمگاتے ہیں۔ اس لیے سر شاہ سلیمان کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قصائد سے نازک خیالی اور فصاحت و بلاغت کا لطف آجاتا ہے اور زبان کے جوہر کھلتے ہیں۔ انھوں نے جو بات برسوں پہلے کہی تھی وہ آج بھی صحیح ہے۔

دادی اماں آج بھی بچوں کو دعا دیتی ہیں "دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو، ہزار برس کی عمر ہو" سب جانتے ہیں کہ ہزار برس تک کوئی نہیں جیتا۔ مگر یہ ایک طرزِ ادا ہے یہ مبالغہ ہے مگر پُر لطف۔ مطلب صرف یہ ہے کہ بہت دن تک زندہ رہو۔ الفاظ کچھ بھی ہوں الفاظ کی روح یہی کہتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قصیدے میں دل اور دماغ دونوں کے جوہر موجود رہتے ہیں۔ حقیقت پسندی اچھی بات ہے پاسباں عقل کو دل کے پاس ضرور رہنا چاہیے لیکن "کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے" شاعری کا لطف یہی ہے اور شعر اسی لیے دل کو لگتا ہے۔

مگر وقت نے اس روشن پیشانی اور چمکیلی آنکھوں والے مرقعِ حسن و خوبی پر جو شاہ محمد سلیمان کہلاتا تھا پردہ ڈال دیا۔ علم و

ادب، سائنس و حساب، قانونی نکتے، سر تیج بہادر سپرو، اور قائداعظم سے ملاقاتیں معرکہ آرا فیصلے اور موشگافیاں سب مرنے والے کے ساتھ چلی گئیں۔ مگر علم و حکمت کے بیش قیمت موتیوں کو گنوانا کوئی مستحسن اقدام نہیں بلکہ تہذیب و ثقافت پر ایک حملہ ہے اس لیے انھیں یاد کرنا ضروری ہے۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

مطبوعاتِ انجمن ترقی اردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

از

جمیل الدین عالی

قیمت حصّہ اوّل =/۱۰۰ روپے حصّہ دوم =/۱۲۵ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

دیوانِ غالب کامل

مرتبہ کالی داس گپتا رضا

قیمت =/۱۵۰ روپے (دوسرا ایڈیشن)

انجمن ترقی اُردو پاکستان

پیٹر بخسل
جرمن ادب کا "طیر آسمانی"

منیر الدین احمد

سوئیٹزرلینڈ کے رہنے والے جرمن ادیب پیٹر بخسل کے ساتھ میرا تعارف اس کی کہانی "غیر معمولی یادداشت والا شخص" کے ذریعہ ہوا، جس میں ایک شخص ریلوے ٹائم ٹیبل کو زبانی یاد کرلیتا ہے اور ہر گاڑی کے بارے میں مکمل معلومات دے سکتا ہے۔ میں یہ کہانی پڑھ کر حیران ہوا تھا کہ پیٹر بخسل کو میرے بھائی نصیر الدین احمد کا کیسے پتہ تھا۔ بھائی نصیر نئے ٹائم ٹیبل کے نکلنے پر اس کو لینے کے لیے گھر سے پیدل چل دیتا تھا اور کم و بیش سات کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے ریلوے اسٹیشن سے ٹائم ٹیبل کی کتاب کو جو اس زمانے میں ایک روپے میں بکتی تھی، لاکر پہلے صفحے سے پڑھنا یا شاید یاد کرنا شروع کرتا تھا اور آخری صفحے تک پڑھ جاتا تھا۔ اس دوران میں کسی کو اس کتاب کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ رات کو وہ اسے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا۔ جب وہ کتاب کو نگل چکنے کے بعد ہاتھ سے رکھتا تھا، تو اسے ہر گاڑی کے بارے میں پتہ ہوتا تھا کہ وہ کب چلتی ہے اور کب کس اسٹیشن پر پہنچتی ہے اور کس روز ناغہ کرتی ہے اور اس کا ملاپ کس جنکشن پر کس ٹرین کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر بھائی نصیر کہانی کے ہیرو کی طرح ریلوے اسٹیشن پر نہیں گھومتا پھرتا تھا اور نہ ہی اس انتظار میں رہتا تھا کہ کوئی اس سے گاڑیوں کے وقت کے بارے میں پوچھے۔ وہ ٹائم ٹیبل کو ہضم کر لینے کے بعد کسی دوسری یاد کیے جانے کے قابل کتاب کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا۔ اسے کتابوں کے حوالے اس طرح یاد تھے کہ کسی صفحے کا نمبر اگر پوچھا جاتا، تو شاید لائن تک بتا سکتا تھا۔ مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی تھی، جب یہ خبر ملی کہ بھائی نصیر قرآن کو حفظ کر رہا تھا۔

پیٹر بخسل کی کہانی کا ہیرو ٹائم ٹیبل کو حفظ کرنے سے تب جاکر ہاتھ اُٹھاتا ہے، جب ریلوے اسٹیشن پر معلومات کی کھڑکی کھل جاتی ہے اور ریلوے کا ایک باوردی کارکن گاڑیوں کے بارے میں ہر قسم کی معلومات ایک کتاب میں سے دیکھ کر دے سکتا ہے۔ پھر کہانی کا ہیرو اچانک اس سے ریلوے اسٹیشن کی سیڑھیوں کے بارے میں پوچھتا ہے، جسے کارکن کسی کتاب میں سے دیکھ کر نہیں بتا سکتا۔ اب ہیرو شہر بھر کی سیڑھیوں کی گنتی کرتا ہے اور پھر دوسرے شہروں کی سیڑھیوں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے کے لیے زندگی میں پہلی بار گاڑی کا سفر کرتا ہے۔ اگر میرے سامنے بھائی نصیر کی مثال نہ ہوتی، تو شاید مجھے یہ کہانی ناقابل یقین لگتی۔ مگر دوسری طرف میں نے یورپ میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ لوگ دن رات معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے میں

لگے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے، جیسے ملک کے سارے باسی ایک دوسرے کے ساتھ ایک مقابلے میں شامل ہیں اس کا سلسلہ بچپن سے شروع ہوتا ہے اور جب کہ ایشیا میں بچوں کو نادان سمجھ کر ان سے کوئی سنجیدہ بات تک نہیں کی جاتی، یورپ میں لوگ اپنے بچوں کو بے حد پیچیدہ مشینیں دکھاتے اور ان کے بنانے کے اصولوں اور چلنے کے ضابطوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ معلومات کو جمع کرنے کا کام مشینی دماغ (کمپیوٹر) کے ذریعے ہونے لگا ہے اور آج کا انسان ایک نئے مشینی انقلاب کے گرداب کے بیچوں بیچ کھڑا ہے۔ معلومات کا ایک سیلاب انسانوں کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتا ہے۔ کہانی کا ہیرو اپنے لیے ایک ذاتی امتیاز چاہتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی بے مصرف کیوں نہ ہو۔

پیٹر بخسل جرمن ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو "تازہ نویس" کہتا ہے۔ وہ نہ صرف لمبے وقفوں کے بعد کوئی کتاب چھاپتا ہے، بلکہ اس کی تحریریں اس قدر مختصر ہوتی ہیں کہ ان کو جلی حروف میں چھاپنا پڑتا ہے، تاکہ ان کو کتابوں میں شمار کیا جاسکے۔ اس کی پہلی کتاب، جو شاید ایک کتابچہ کہلانے کی بھی مستحق نہیں ہے، اکیس مِنی کہانیوں پر مشتمل ہے، جن میں سے کوئی کہانی دو صفحوں سے زیادہ حجم نہیں رکھتی۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے قاری کو فوراً اس امر کا احساس ہوگا کہ یہاں پر ایک مصور لفظوں سے ایک تصویر بنا رہا ہے، جو کسی ماڈرن پینٹنگ کی طرح کفایت شعاری کا مرقع ہے۔ مصور کی طرح مصنف لکیریں نہیں کھینچتا، بلکہ محض اشاروں پر اکتفا کرتا ہے۔ اور تصویر دراصل کاغذ پر نہیں بنتی، بلکہ خود قاری کے ذہن میں تشکیل پاتی ہے۔ اس میں رنگ بھرنے کا کام وہ فقرے کرتے ہیں، جو دراصل تحریر میں نہیں لائے گئے۔ مگر قاری انہیں جانتا ہے اور کہانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کو پُر کرتا جاتا ہے۔ گویا الفاظ اور فقروں سے زیادہ اوقاف قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ایکشن نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر مصنف کسی بھی کہانی میں سامنے نہیں آتا۔ مگر وہ حاضر ہے اور قاری کے ساتھ قدم ملا کر چلتا ہے، بلکہ درحقیقت وہ خود بھی قاری ہے۔ زبان سادہ ہے اور فقرے مختصر ہیں، جن کا آپس کا ربط نظر نہیں آتا، بلکہ یوں لگتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ صنائع و بدائع کا قطعی فقدان ہے اور شعریت کا شائبہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے باوجود اور واضح طور پر اوپر بیان کردہ خواص کی وجہ سے اس کتاب کا استقبال جرمن ادب کے نقادوں نے ولولے کے ساتھ کیا۔ پیٹر بخسل نے زبان و بیان کی پیچیدگیوں میں کھوئے ہوئے جرمن ادیبوں کی پیروی کرنے سے انکار کرتے ہوئے نئی پود کو ایک نئی راہ دکھائی۔ اور آئندہ سالوں میں اس کی نقل کرنے والوں کی ایک پوری فوج پیدا ہوگئی۔ آج بھی بالخصوص سوئٹیزر لینڈ کے اخباروں کے ادبی ایڈیشنوں میں ایسی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ (ان میں سے بعض کہانیاں "قومی زبان" میں چھپ چکی ہیں)۔

یہ کہانیاں اگرچہ نامکمل ہیں، مگر ان میں ایک ڈھانچہ پیش کیا جاتا ہے، جس میں قاری اپنی پسند کے مطابق ردوبدل کر سکتا ہے۔ مصنف قاری کو کسی خاص پلاٹ کا پابند نہیں کرتا، نہ ہی اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ کہانی کا انجام طربیہ ہو یا المیہ۔ "مکان کی منزلیں" میں کوئی مرکزی کردار پیش نہیں کیا جاتا۔ اگر قاری چاہے، تو وہ اپنی کہانی میں کرداروں کو لاسکتا ہے۔ مثلاً تیسری منزل والی بچی کو، جس کی گیند دوسری منزل کی بالکنی پر گر گئی ہے۔ یا اس عورت کو، جو دوسری منزل پر بچی کے گھنٹی بجانے پر دروازہ کھولتی ہے۔ وہ اگر چاہے، تو لڑکی کو گیند دے سکتی ہے، اور اگر چاہے، تو انکار بھی کر سکتی ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ "گھر منگتے" بھی مرکزی کردار بن سکتے ہیں، یا وہ ٹیلی فون کا مکینک، جو کنکشن بدلتا ہے۔ اور جنگل کا چوکیدار کہاں سے اچانک آن ٹپکا ہے۔ اور عورتوں کا تعلق کیوں انتظار کرنے سے ہوتا ہے؟ اس کا جواب کہانی کے اگلے فقرے میں موجود ہے۔ "مکان صرف مکان

ہوتے ہیں" دوسری ہر چیز کسی واسطے سے پہچانی جاتی ہے اور یہ سوال کہ عورتوں کا تعلق کیوں انتظار کرنے سے ہوتا ہے، تو یہ سوال ہمیں معاشرے سے کرنا چاہیے۔

دوسری کہانی اگرچہ ایک لڑکی کے گرد گھومتی ہے، مگر بنیادی طور پر وہ مردوں میں ہے، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ لڑکی ان کی نظروں کا مرکز ہے اور ان کی ہوس کا شکار۔ وہ اسے روز دیکھتے ہیں، لمحہ لمحہ اس کی خبر رکھتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ وہ کب آتی ہے، کس گاڑی سے جاتی ہے، کس کا انتظار کرتی ہے، کیا پہنتی ہے، کہاں بیٹھتی ہے۔ اور کبھی کبھار کوئی مرد اس کی کافی کے پیسے ادا کر دیتا ہے۔ مگر بات اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی دوشیزگی بھی زیر غور آتی ہے اگرچہ مردوں کو امید ہے کہ وہ عورت بن چکی ہوگی۔

"پھول" نامی کہانی ایک خوبصورت رومانی داستان ہے، جس میں آگ دونوں طرف لگی ہوئی ہے۔ اور قاری کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہانی تخیل میں چل رہی ہے یا حقیقت میں چل رہی ہے کہانی کے دونوں کردار ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اور اگرچہ وہ ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور شاید آچکے ہیں، وہ آخر تک اپنے فطری حجاب کا شکار لگتے ہیں۔ مصنف کہانی کو مکمل نہیں کرتا، جب کہ قاری اسے کبھی کا اختتام تک پہنچا چکا ہے۔

"نومبر" نامی کہانی ایک ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے، آدمی کی کہانی ہے، جو سرما کے تصور سے ہی ٹھٹھرنے لگتا ہے۔ مگر کوئی اس کے خوف کو نہیں سمجھتا۔ اسے پتہ ہے کہ انسان سردیوں میں کہیں کا نہیں رہتا اور سردیوں میں ہر بات ممکن ہے، مثال کے طور پر جنگ۔ کون ہے، جو اس کہانی میں اپنے آپ کو نہیں پاتا؟ پیٹر بخسل کی اکثر کہانیاں علامتی ہوتی ہیں، مگر اس کہانی میں "سرما" کی علامت بہت بلیغ ہے۔

ان مختصر مختصر کہانیوں میں "دودھ والا" ایک شاہکار کہانی ہے، جس سے ان کہانیوں کے مجموعے کا عنوان (فراؤ بلوم دودھ والے سے ملنا چاہتی ہے") لیا گیا تھا۔ مگر اس عرصے میں یہ کہانی ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے، کیونکہ ایسے دودھ والے اب سوئٹیزرلینڈ میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اب کوئی دودھ والا صبح چار بجے دودھ لے کر نہیں آتا۔ اور دودھ کے لیے برتن مکانوں کے دروازے پر دھرے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود کہانی انسانوں کے آپس کے ٹوٹے ہوئے روابط پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔ اور اگر کوئی فلم ساز پانچویں دہائی کے یورپ کو دکھانا چاہتا ہو، تو یہ کہانی اس کے لیے فلم کا پورا ڈھانچہ مہیا کر سکتی ہے۔ البتہ رنگ و روغن اسے خود کرنا پڑے گا، کیونکہ پیٹر بخسل کی کہانیاں ہر قسم کی سجاوٹ سے عاری ہوتی ہیں۔

پہلی کتاب کے چھپنے کے پورے دس برسوں کے بعد پیٹر بخسل نے "بچوں کی کہانیاں" کے عنوان سے سات کہانیاں پیش کیں، جن کو سات برس سے لے کر ستر برس تک کہ بچے آج بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں ("قومی زبان" میں ان میں سے بعض کہانیوں کے تراجم چھپ چکے ہیں) قاری کا پہلا تاثر غالباً یہ ہوگا کہ یہاں پر کھلنڈرے انداز میں ایک غیر حقیقی دنیا کی باتیں سنائی جارہی ہیں، جو بے مطلب ہیں اور ان کا کوئی اثر بھی مرتب نہیں ہوگا۔ ۱۹۸۶ء میں ہم چلی کے سفر پر اپنے بھتیجے موبی کو، جس کی عمر اس وقت گیارہ برس تھی، ساتھ لے گئے تھے۔ موبی نے انہی دنوں میں اپنے مدرسہ کی ریڈر میں پیٹر بخسل کی کہانی "یوڈوک سلام بھیجتا ہے"، جو دادا کا چچا تھا، پڑھی تھی۔ پورے سفر کے دوران یہ چچا یوڈوک (جو اس صورت میں موبی کا چچا، گویا میں تھا) ہمارے ہمراہ رہا اور اس نے ہمارے سفر کو ناقابلِ فراموش بنا دیا۔ مجھے موبی کے ردِ عمل سے اندازہ ہوا کہ پیٹر بخسل کی کہانیاں بچوں کے اندر تخیل کی کیسی دلچسپ دنیا کے دروازے وا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اور جیسا کہ موبی کی مثال دکھاتی ہے، بچے

کہانیوں کی توسیع اور تکمیل اپنی افتادِ طبع کے مطابق کرتے ہیں۔

کیا آپ کے دل میں کبھی شکوک پیدا نہیں ہوئے کہ وہ سب باتیں درست نہیں ہوسکتیں، جو ہمیں دن رات باور کروائی جاتی ہیں؟ مجھے یہ شبہ ہے، نہیں مجھے یقین ہے کہ نہ صرف سیاستدان اور اخبارات جھوٹ بولتے ہیں، بلکہ ہمارے ارد گرد فریب و مکر کا ایک پورا جال بچھا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کے گول ہونے سے انکار کر دیتا ہے، تو کیا عجب ہے۔ میرا ایک دوست آج تک نہیں مانتا کہ امریکن اسٹرونوٹ نیل آرمسٹرونگ چاند پر اترا تھا۔ اسے شبہ ہے کہ امریکنوں نے نوادا کے صحرا میں یہ ناٹک کھیلا تھا۔ آئے دن ایسی خبریں نظر سے گزرتی ہیں کہ کسی سائنس داں نے اپنے تجربات کے نتائج میں ردو بدل کیا۔ اس دوران میں ہر کوئی جانتا ہے کہ دواساز کمپنیوں کے ہر دعوی کو قبول نہ کرنا چاہیے۔ کیا عجب ہے کہ ایسے ماحول میں کہانی کا ہیرو خود پڑتال کرنی چاہتا ہے کہ کیا سچ مچ "زمین گول ہے۔"

"ایک میز ایک میز ہے" ایک بوڑھے کی کہانی ہے، جس کا اکلاپا اس کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے، علم نفسیات ہمیں بتاتا ہے کہ ہر شخص کی زبان اپنے معانی کے اعتبار سے اس کی بالکل ذاتی زبان ہوتی ہے۔ اور ایک بوڑھا جوں جوں تنہائی کا شکار ہوتا جائے گا، توں توں اس کی زبان کا سمجھنا دوسروں کے لیے مشکل ہوتا جائے گا۔ اور خود اس کے لیے دوسروں تک رسائی کے رستے مسدود ہوتے چلے جائیں گے۔ پیٹر بخسل کا بوڑھا ایک قدم آگے نکل جاتا ہے اور ایک نئی زبان ایجاد کرتا ہے، جس کو اس کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جنھوں نے کوئی نئی زبان ایجاد نہیں کی اور وہ وہی زبان بولتے ہیں، جو سب لوگ بولتے ہیں اور جو اخباروں میں لکھی جاتی اور ریڈیو اور ٹیلی وژن پر نشر ہوتی ہے۔ مگر کوئی ان کی بات نہیں سنتا، نہ سمجھتا ہے۔ انسان ان لوگوں کو پارکوں میں، سڑکوں پر، گاڑیوں میں اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ ان سے ملنے کے لیے انسان کو پاگل خانے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئینہ میں دیکھ لینا کافی ہے۔

"امریکہ نہیں پایا جاتا ہے"، اس لیے کہ ایک مسخرے نے اپنے بادشاہ کے سامنے سرخرو ہونے کے خیال سے ایک فرضی ملک کی دریافت کا دعوی کیا، جس کی تصدیق آج تک نہیں ہوسکی۔ گویا وہ ملک، جو اس نام سے مشہور ہے، دراصل ایک فکشن ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جو امریکہ کو ہالی وڈ فلم انڈسٹری کا اسسٹنٹ سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کہانی سنانے والا کولمبس کو مسخرا قرار دیتا ہے، تو شاید وہ غلطی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اس مسخرے کو آخر تک یقین نہ آیا تھا کہ اس نے ہندوستان کو دریافت نہیں کیا تھا۔ کیا آپ کے دل میں، کیا میرے دل میں یہ خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ امریکہ دریافت نہ ہوتا، تو اچھا تھا؟ ایریش فریڈ (ERICHFRIED) نے اپنی ایک نظم میں انھیں جذبات کا اظہار کیا تھا۔

سفرِ نادریافت

دنیا کی سیاسی حالت کو بہتر بنانے کے لیے
افریقہ کے شمالی ساحل پر
ایک بندرگاہ میں
تین جہاز نہایت خفیہ طور پر تیار کیے جا رہے ہیں
سانتا ماریا، پنتا اور نینا کی ہو بہو نقلیں

وہ بہت جلد اپنا سفر شروع کریں گے
اور مغرب کا رُخ کریں گے
اور امریکہ کی دیافت کو
بھلانے کا کارنامہ سرانجام دیں گے

ایک موجد، جو شہروں کی گہما گہمی کو خیر باد کہہ کر ویرانے میں ڈیرا جما لیتا ہے اور ہر چیز کو نئے سرے سے ایجاد کرتا ہے، کیا اس کا تصور اتنا غیر معمولی امر ہے کہ ہمیں اس کہانی کو سچ ماننے میں تامل ہو سکتا ہے؟ اور وہ "آدمی، جو مزید کچھ نہیں جاننا چاہتا تھا"، اس سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس قضیے میں چینی زبان نہیں سیکھ پاتا۔ مگر اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پیٹر بخسل نے یہ کہانیاں اتنے وثوق کے ساتھ سُنائی ہیں کہ ان کو جُھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اگر پیٹر بخسل نے ان کہانیوں کے سوا اور کچھ نہ لکھا ہوتا (اس نے اس کے علاوہ افسانے، انشائیے اور ایک ناول لکھا ہے)، تب بھی اسے جرمن ادب میں ایک معزز مقام دیا جاتا۔ اپنے وطن سوئیٹزرلینڈ میں لوگ اسے اخباروں کے حوالے سے بھی جانتے ہیں، کیونکہ وہ اخباروں میں کالم لکھتا ہے اور سیاسی معاملات میں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے۔ اس کی تقریروں کی بھی شہرت ہے، جن کا ایک مجموعہ چھپا ہوا ہے۔ اخباری کالموں کو بھی کتابی صورت میں چھاپا گیا ہے۔

فرانکفورٹ یونیورسٹی کی طرف سے ہر سال سرما کے سمسٹر میں کسی ادیب، شاعر یا نقاد کو ادب پر پانچ لیکچر دینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اب یہ چیز ایک اہم روایت بن چکی ہے اور سارا سال ادبیات کے طالب علم اور دوسرے ادب نواز بے چینی کے ساتھ ان خطبات کا انتظار کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے فنڈز کی ادائیگی ابتداء سے ہی مشہور پبلشر فشر فرلاگ کی طرف سے کی جاتی ہے، جس نے اس وقف کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سلسلے کے پہلے لیکچرز ۱۹۵۹ء - ۱۹۶۰ء میں آسٹرین شاعرہ انگے بورگ باخمن (۱۹۲۶ء - ۱۹۷۳ء) نے دیے تھے۔ یہ سلسلہ گویا پینتیس سال سے جاری ہے۔ ۱۹۸۱ء - ۱۹۸۲ء کے ونٹر سمسٹر میں پیٹر بخسل کی باری تھی۔ جس کے اس موقع پر دیے گئے پانچوں لیکچروں کے ترجمے "ادبیات" میں چھپ چکے ہیں۔

جب میں نے ان خطبات کو پہلی بار پڑھا، تو میرے سامنے ایک بالکل نیا پیٹر بخسل کھڑا تھا، جس کو میں اس کی کہانیوں سے نہیں جانتا تھا۔ البتہ مجھے ان لیکچروں میں بھی اس کا کھلنڈرا انداز نظر آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بعض باتوں میں ہم دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے تھے۔ مثلاً یہ بات کہ کہانی سنانا ادب کا اصل مدعا ہے، نہ کہ متن۔ یہ بات میں اپنے افسانے کے پہلے مجموعے "زرد ستارہ" میں اپنے بھتیجے موبی کے حوالے سے ان الفاظ میں لکھ چکا تھا۔

"میرا بھتیجا موبی جب اڑھائی تین برس کا تھا، تو کاغذ اور پنسل لے کر میرے پاس آتا تھا اور تصویر بنانے کی فرمائش کرتا تھا۔ جب تصویر بن جاتی تھی، تو کہتا تھا "چچا، اب مجھے اس کی کہانی سناؤ" چنانچہ مجھے اس تصویر کو سامنے رکھ کر کوئی کہانی تخلیق کرنی پڑتی تھی۔ موبی کے لیے کہانی کا متن اہمیت نہ رکھتا تھا، بلکہ میرا کہانی سنانا۔"

میرے اور پیٹر بخسل کے درمیان ایک اور بات کے سلسلے میں بھی اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ اور وہ حقیقت نگاری کا مسئلہ ہے میں نے لکھا تھا۔

"افسانوں میں میری زندگی مرقوم ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں سچی کہانیوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود وہ حرف بحرف سچ ہیں، کیونکہ وہ میری تخلیق ہیں۔ میرے مدنظر کہانی لکھتے ہوئے یہ امر نہیں ہوتا کہ حقیقت کی عکاسی کی جائے، کیونکہ حقیقت اکثر صورتوں میں غیر اہم ہوتی ہے اور کہانی پن سے عاری۔ پر کہانی سنانے کے لیے آخر حقیقت کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

پیٹر بخسل نے اس چیز کو ایک اور پہلو سے لیا ہے، چنانچہ اس کے الفاظ میں "کہانیاں سنانے والے کو انسان جان سے مار ڈالتا ہے، جب اس پر حقیقت نگاری کی قید لگادی جاتی ہے" دوسری جگہ پر وہ اس کی تشریح اس طرح کرتا ہے۔ "جب میں افسانے لکھتا ہوں، تو حقیقت کو بیان نہیں کرتا، بلکہ حقیقت کے مختلف امکانات کو" یہ سوال کہ کیا افسانہ سچ ہے، بنیادی طور پر دو غلط فہمیوں کے سبب اٹھایا جاتا ہے۔ اوّل تو یہ جاننا چاہیے کہ کوئی کہانی نہیں پائی جاتی، جس میں سچ کا عنصر موجودہ نہ ہو، کیونکہ اصولی طور پر ایجاد کوئی شے نہیں ہے۔ دوسری یہ بات کہ زبان چیزوں کو صرف بیان کرسکتی ہے، وہ ان کو ہو بہو پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

میرے لیے پیٹر بخسل کا یہ بیان کہ "بدیسی ادب نہیں پایا جاتا" اور یہ کہ "ادب خود ادب کے اندر پیدا ہوتا ہے" ایک دریافت سے کم درجہ نہیں رکھتا۔ اب جبکہ اس کا یہ دعویٰ میرے سامنے ہے، مجھے بے شمار شواہد اس بات کے حق میں سوجھ رہے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی۔ پیٹر بخسل نے ایک جگہ پر کہا ہے کہ اس کے ادیب بننے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ پیدا ہوا، تو ادب پایا جاتا تھا اور انسان ادیب بن سکتا تھا۔ دوسری بات، جو مجھے بالکل الہامی لگی، یہ تھی کہ کہانیوں کے سنائے جانے کا تعلق وقت سے ہے۔ اور اس بات سے کہ ہم اپنی زندگی کو وقت کے رنگ میں دیکھتے ہیں۔ کہانیوں کا سنانا وقت کے ساتھ برتاؤ سے تعلق رکھتا ہے اور اس بات کا تعلق کہ ہم اپنی زندگی کو بطور وقت دیکھتے ہیں، اس بات سے ہے کہ ہماری زندگی فانی ہے اور کہانیاں سنانے کا تعلق فنا پر گہری دلگیری اور اس دلگیری کو قبول کرنے سے ہے۔

یہ دلگیری ہی تو ہے، جو انسانوں کو کہانیاں سنانے پر مجبور کرتی ہے۔ جب بوڑھے اپنی جوانی کی باتیں کرنے لگتے ہیں، اور ان وقتوں کے قصے سناتے ہیں، جب دنیا رنگوں اور گیتوں سے بھری ہوئی تھی، تو وہ دراصل اپنی اس دلگیری پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ پیٹر بخسل نے جرمنی کی مثال دی ہے اور ان لوگوں کی، جن کی جوانی کے سال جنگ کی نذر ہوگئے تھے۔ اور انھوں نے ان کو ضائع شدہ سالوں کے طور پر تسلیم کرلیا تھا۔ اب بڑھاپے میں ان کو ان سالوں کے تلف ہوجانے کا رنج ہے اور وہ ان کو کہانیاں سنا کر واپس لانا چاہتے ہیں۔ "جو کوئی زندگی کو بسر نہیں کرتا، اسے اس کی کہانی سنانی پڑتی ہے"

یہ امر اس وجہ سے ممکن ہے، کیونکہ کہانیاں پائی جاتی ہیں اور ادب پایا جاتا ہے، جو دہرائے جانے سے عبارت ہے۔ کہانیاں دراصل ساری سنائی جاچکی ہیں۔ اگر ہم اس کے باجود نت نئی کہانیاں تخلیق کرتے ہیں۔ تو اس لیے کہ ہم زندگی کو قابل برداشت بنانا چاہتے ہیں۔ کہانیاں ہماری زندگی کو بچا نہیں سکتیں، مگر وہ اسے قابل برداشت بنا سکتی ہیں۔

ایک غلط فہمی بہت عام ہے کہ صرف غیر معمولی انسانوں کی کہانی سنائی جاسکتی ہے یا صرف انھیں اپنی کہانی سنانے کا حق حاصل ہے۔ درحقیقت ہر زندگی میں ایک کہانی پائی جاتی ہے، بشرطیکہ انسان اس کو سنانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اور حق حاصل ہے۔ درحقیقت ہر زندگی کی ایک کہانی پائی جاتی ہے بشرطیکہ انسان کو سنانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اور اس کی تکنیک اسے آتی ہو۔ تکنیک کی ایجاد ادب کا اوّلین فرض ہے۔ اور ادیبوں کو کہانیاں اس لیے سنانی ہوتی ہیں، تاکہ مزید زندگیاں سنائے جانے کے قابل بن

سکیں۔

یہ امر بھی تکنیک سے تعلق رکھتا ہے کہ انسان کہانی کے مبدء کو جان سکے، جو اس سوال کا جواب ہو سکتا ہے: کیا ہوتا اگر؟ ایک کانفرنس میں میرے دائیں ہاتھ پر اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر ڈاکٹر خراسانی اقوام متحدہ میں بیٹھے ہوئے تھے جب اچانک ہال کا دروازہ کھلا اور ایک "مجاہدین خلق" کے ممبر نے ان پر بم پھینکا، جو ان کی پیٹھ پر لگا۔ خوش قسمتی سے وہ گندا انڈا تھا اور سوائے بو پھیلانے کے اور کوئی نقصان نہ کر سکا۔ اگر وہ بم ہوتا تو کیا ہو سکتا تھا، یہاں سے کہانی پیدا ہوتی ہے۔ پیٹر بخسل نے ہومر کی کہانی اوڈیسوئیس (ODYSSEUS) کی مثال دی ہے، جس میں گھر لوٹنے کی داستان کو اس رنگ میں سنایا گیا ہے کہ کیا ہوتا اگر اوڈیسوئیس کو رستے میں کانے دیو کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ گویا ہومر نے گھر لوٹنے کی دشوار کہانی کو بیان نہیں کیا، بلکہ بہت سی وجوہات اس سفر میں تاخیر کی پیش کی ہیں۔ گونتھر گراس کی کہانی "ٹین کا ڈھول (BLECHTROMMEL) کے پس منظر میں یہ سوال اہمیت رکھتا ہے کہ کیا ہوا اگر چھوٹے اوسکار کا قد نہیں بڑھتا اور وہ بلوغت کو نہیں پہنچتا۔ میں نے بچپن میں ایک ایسے کردار کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بڑے تو خیر اس کے ساتھ مذاق کرتے ہی تھے، ہم بچے بھی اس کو پکڑ کر اس سے گیارہ کا پہاڑا سنا کرتے تھے، جسے وہ مٹھی مارتے ہوئے سناتا تھا۔

ادیب لکھتے ہوئے آزاد نہیں ہوتا۔ پیٹر بخسل کے الفاظ میں "مصنف کو خود اپنا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ خود اپنے آپ پر رحم کھاتا ہوا انسان وہ کچھ نہیں لکھ سکتا، جو اسے لکھنا چاہیے، لکھنا ہوتا ہے یا وہ لکھنا چاہتا ہے" اپنی آزادی کی حدود کو وہ خود مقرر نہیں کرتا، مگر جرمن اصطلاح کے مطابق اس کے "دماغ میں قینچی" ان سرحدوں کو مقرر کرتی ہے جن کو عبور کرنے سے اسے اجتناب کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف خود تحریر اور عبارت کا ایک اپنا بہاؤ ہوتا ہے، جس کے سامنے مصنف لاچار ہوتا ہے۔ پیٹر بخسل کے الفاظ میں کہانی ہمیشہ جیت جاتی ہے "صرف ان معنوں میں کہا جا سکتا ہے تحریر لکھتی ہے، نہ کہ مصنف۔"

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ مصنف لکھنے کے عمل سے اپنے آپ کو اپنے مسائل، مشکلات، ہموم اور یادوں سے آزاد کرواتا ہے۔ پیٹر بخسل اسے ایک افواہ قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک لکھنا ایک طرح سے ملکیت میں لینا ہے۔ لکھے ہوئے سے انسان پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس سلسلے میں وہ بوڑھے ادیبوں کی مثال دیتا ہے، جو اس لیے لکھنے سے باز نہیں آجاتے ہیں کہ انہیں موضوعات کی قلت کا سامنا ہوتا ہے یا توانائی کی کمی کا۔ "ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کبھی کا اپنے سارے پنڈے کو لکھائی سے بھر دیا ہو۔ اس حد تک کہ نئی چیزوں کے لیے بالکل کوئی جگہ باقی نہ بچی ہو، کہ ان کی پیٹھ پر اس قدر لد چکا ہو کہ ان میں مزید بوجھ اٹھانے کی سکت باقی نہ ہو۔"

قاری کی اہمیت کا احساس آہستہ آہستہ ادبی تنقید میں بڑھتا جاتا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو قاری کو اولین درجہ دینے لگے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قاری کا تصور مصنف اور اس کی تصنیف کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کہانی، جسے مصنف نے لکھا تھا، قاری تک پہنچتے پہنچتے کچھ سے کچھ بن جاتی۔ ادبی تنقید اب زیادہ سے زیادہ اس کہانی میں دلچسپی لینے لگی ہے، جو قاری کے ذہن میں جا کر تشکیل پاتی ہے۔ پیٹر بخسل قاری کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہے، بلکہ وہ خود اپنے آپ کو ادیب سے زیادہ قاری سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "قاری روگی ہوتے ہیں۔ قاری ہر چیز کو پڑھنے والے ہوتے ہیں" بھائی نصیر بھی روگی تھا۔ وہ ہر چیز کو پڑھتا تھا حتیٰ کہ زمین پر گرے ہوئے کاغذ کو بھی اٹھا کر پڑھتا تھا۔ میں کسی دوسرے شخص کو نہیں جانتا ہوں، اس جیسا روگی قاری ہے۔ وہ ہر کتاب اور ہر اخبار اور ہر رسالے کو اول سے آخر تک پڑھتا تھا۔ شہر کی کوئی لائبریری اس کی دسترس سے

باہر اور اس سے محفوظ نہ تھی۔ ہم بہن بھائیوں کی کورس کی کتابیں بھی وہ بلا تکان پڑھ گیا۔ اور اس دوران میں کئی زبانوں کا ماہر بن گیا۔

پیٹر بخسل ادب کے نقادوں سے خوش نہیں ہے۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ وہ ادب کو، جو اس کے نزدیک ایک ثانوی چیز ہے۔ غیر ضروری اہمیت دیتے ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ وہ اپنا فرض منصبی ادا نہیں کرتے، جو "صرف اکیلے دکیلے قاری کا کھلے بندوں شریکِ گفتگو ہم قاری ہونا ہے" ادیبوں کو عام طور سے نقادوں سے یہ گلہ ہے کہ بہت سرسری طور پر مطالعہ کرتے ہیں (اردو کے ایک "مقتدر" نقاد کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ موصوف نے شاید کبھی کوئی کتاب اوّل سے آخر تک نہیں پڑھی)، جس کے سبب وہ ادب پاروں کی روح کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس سلسلے میں گابریل لاؤب کا ایک اور افورسم پیش کیا جاسکتا ہے "نقاد، جنھیں لکھنا نہیں آتا، وہ ان نقادوں سے بہتر ہیں، جنھیں پڑھنا نہیں آتا" بد قسمتی سے اردو ادب کے نقادوں کو بدیسی غذا نہ پچنے کے سبب بدہضمی کا عارضہ لاحق ہے۔ اور اب تو تشکیلیت اور ردِ تشکیلیت نے ان کی مت ماردی ہے۔

مجھے پیٹر بخسل کا یہ دعویٰ بہت دلچسپ لگتا ہے کہ "ادب ایک ثانوی چیز ہے" یوروپ میں یہی بات فٹ بال کے بارے میں کہی جاتی ہے، جسے عام طور سے زندگی کی "بہترین ثانوی چیز قرار دیا جاتا ہے۔ کیا فی الواقع ہماری زندگی بے شمار ثانوی چیزوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہی ثانوی چیزیں مل کر اسے قابلِ برداشت بناتی ہیں۔ پیٹر بخسل کا کہنا ہے کہ اگر ادب ثانوی چیز نہ ہوتا تو سیاست داں کبھی کے اِس پر قبضہ جما چکے ہوتے۔ اسے شاید بھول گیا ہے کہ کمیونسٹ ملکوں میں ادب پر ریاست کی اجارہ داری تھی۔ مشرقی جرمنی میں یہی صورت حال تھی، اگرچہ وہاں پر کسی زمانے میں بھی سارے ادیبوں کو پارٹی لائن پر نہ لایا جاسکا۔ انحراف کرنے والوں کا بائیکاٹ کیا جاتا تھا اور ان کی کتابیں ملک میں نہ چھپ سکتی تھیں۔ بہتوں کو اس جرم کی پاداش میں سالوں تک جیل و بند کی سزا بھگتنی پڑی۔ میرے دوست یواخیم زائیپل کو اس وجہ سے مشرقی جرمنی کی شہریت سے نکال دیا گیا تھا۔ مغربی جرمنی میں صورتِ حال اس سے مختلف تھی۔ البتہ ایک وقت ایسا ضرور آیا تھا، جب چانسلر ایرہارڈ نے ادیبوں کو "پنشر" (کتوں کی ایک نسل) کے نام سے یاد کیا تھا۔ ادیبوں کی اکثریت اس وقت اور آج بھی بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک بڑی تعداد سیاسی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی معاملات پر بحث و مباحثہ میں بھرپور حصہ لیتی ہے۔ گونتھر آئش کے نزدیک ادب کا اوّلین فرض "دنیا کی مشینری میں ریت ہونا ہے، نہ کہ تیل، بعض ملکوں میں پھر سے ایسے رجحانات نظر آرہے ہیں، جہاں پر ریاست پھر ایک بار ادب جیسی "ثانوی" چیز کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اسلامی ممالک کے نام بھی لیے جاتے ہیں، جہاں پر نہ صرف "اسلامی طب" اور "اسلامی سائنس" (جیسے اسلامی اور غیر اسلامی پنسلین اور غیر اسلامی کاربن ڈائی آکسائیڈ پائی جاتی ہیں) کا پرچار ہونے لگا ہے، بلکہ ادب کو بھی مشرف بہ اسلام کیے جانے کا ذکر دیکھنے میں آتا ہے۔

پیٹر بخسل سے میں صرف ایک بار ملا ہوں۔ وہ اپنی کتاب کی پروموشن کے سلسلے میں ہمبرگ آیا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ پنڈو لگتا تھا، جو بھول کر شہر میں آنکلا تھا۔ بکھرے ہوئے بال، جو پھر سے روشن فکری کی علامت سمجھے جانے لگے ہیں، اور گول عینک، جس کے پیچھے گول مٹول آنکھیں کسی قدر حیرانی سے جھانک رہی تھیں۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے سارے لوگ اسے سننے کے لیے آئے تھے۔ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے انھیں دنوں میں اس کی کہانی "غیر معمولی یادداشت والا شخص" پڑھی تھی اور اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ چونکہ وہ ابھی کہیں پر نہ چھپا تھا، اس لیے میں نے اسے اپنے قلمی نسخے کی ایک نقل پیش کی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے اپنی ایک کتاب تحفے میں دی اور اس پر لکھا کہ اس نے اپنی کسی کہانی کا اس

سے زیادہ خوبصورت ترجمہ نہیں دیکھا۔ اس فقرے کی تہہ میں مجھے اس کی مخصوص طنز نظر آئی، مگر اس نے کہا کہ وہ اردو رسم الخط کی خوبصورتی سے بے حد متاثر تھا اور قطعاً کسی قسم کی طنز کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اسی قسم کی مشکل کا سامنا عام طور سے پیٹر بخسل کے قارئین کو کرنا پڑتا ہے، جو اس کی کہانی کو پڑھنے کے بعد نہیں کہہ سکتے کہ کیا مصنف وہی کچھ کہنا چاہتا تھا، جو انھوں نے سمجھا ہے یا اس کا مدعا دوسرا تھا۔

(پیٹر بخسل پر میری کتاب ("پیٹر بخسل: کہانیاں، افسانے خطبات بوطیقا") پریس میں ہے، جسے مکتبہ ادب لطیف، لاہور چھاپ رہا ہے۔ امید ہے کہ کتاب اس سال کے اواخر تک مارکیٹ میں آجائے گی۔)

الف لیلہ ولیلہ

مترجمہ: ڈاکٹر ابوالمنصور احمد

جلد اوّل تا ہفتم: قیمت =/۸۹۰

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی ۱۵۹- بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

قدیم شعرا، محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کے کلام کا جامع انتخاب اور تعارف

غزل نما

جس کو محترمہ ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور مطالعے کے بعد ترتیب دیا

طلبہ اور ریسرچ اسکالر دونوں اس سے مستفید ہو سکتے ہیں

قیمت =/۱۰۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان- ۱۵۹- بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

قومی زبان (۵۱) نومبر ۱۹۹۴ء

جدید صنعتی عہد اور اُردو غزل

ن۔ م دانش

اگر اردو غزل کے سفر کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کئی رُخ اور کئی جہتیں نظر آئیں گی جو پیچیدہ بھی ہیں اور ہمہ گیر بھی۔ ولی میر اور غالب سے لے کے آج تک کے اردو غزل نے کئی منزلیں طے کی ہیں اس سفر میں کبھی اس کی شکستہ پائی کا غلغلہ ہوا ، کبھی اس کے مردہ ہونے کا ماتم کیا گیا اور کبھی اس کی تنگ دامانی کا گلہ۔ کبھی یہ اعلان کہ غزل زندگی کے نئے مسائل اپنے دامن میں جگہ دینے سے قاصر ہے۔ کبھی یہ جواز کہ زندگی سمندر ہے اور غزل آبجو۔ اسی لیے غزل زندگی کی جامعیت، کلیت اور وسعت کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے۔

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

لہذا اسے دست برد زمانہ ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور اس کی جگہ نظم کو دی جائے۔ لیکن حسرت، فانی، یگانہ، اصغر اور فراق نے نہ صرف غزل کی آبرو بچائی بلکہ اسے ایک نئی رفعت عطا کی۔ غزل کے خلاف جتنے اعتراضات اٹھائے گئے تھے، وہ دم توڑ گئے۔ غزل نے ایک جست لگائی اور نظم کے "وقت کا تقاضا" ہونے کے باوجود جدید شاعروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو گئی۔

آج کے عہد میں جسے نظم کا عہد کہنا چاہیے۔ نہ صرف غزل زندہ ہے بلکہ متحرک بھی ہے۔ اس نے نہ صرف سنجیدہ اور جدید قارئین کا ایک حلقہ پیدا کیا ہے بلکہ نثری نظم کے دلدادہ شعرا بھی خوب صورت غزلیں تخلیق کر رہے ہیں۔ غزل پر، "صنف نازک سے گفتگو" کا وسیلہ ہونے کے باوجود بھی چیزے دگر حاوی ہے جدید زمانے کے مسائل آج کی غزل کے موضوعات ہیں۔ آج بھی اس ذوق و شوق سے نظم نہیں پڑھی جاتی جتنے ذوق و شوق سے غزل پڑھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غزل کو بیان کے لیے جس وسعت کی ضرورت تھی وہ بہت حد تک اسے میسّر آگئی ہے آج غزل پر تنگ دامانی کا الزام نہ صرف فرسودہ ہو چکا ہے بلکہ بے معنی بھی، اس لیے کہ عصرِ حاضر کے مسائل کو غزل کی ہیئت میں اور شعری زبان کی وساطت سے جس صداقت اور خلوص کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اس سے نہ صرف اس مسئلہ کا ادراک ہو رہا ہے بلکہ قاری شاعر کے جمالیاتی تجربے میں بھی شریک ہو جاتا ہے۔

جدید غزل یا نئی غزل کے مطالعے کے کئی رُخ ہیں جیسے جدید حسیّت، نئی جمالیات یا نئی اقدار اور نئے شعری لسانیات کے حوالے سے اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں ان رُخوں یا سمتوں کا حوالہ جزوی طور پر یا بر سبیلِ تذکرہ آئے گا کیونکہ میرا

موضوع ہے۔ بنیادی طور پر صنعتی عہد کے آنے سے زندگی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کا اظہار غزل میں کس طرح ہو رہا ہے، نئی غزل کے جمالیاتی رویے اور اس کی زبان بذات خود، الگ مضامین کے متقاضی ہیں۔

ہر عہد اپنے مسائل خود لے کر آتا ہے اس اعتبار سے ہر عہد دوسرے عہد سے مختلف ہوتا ہے، اور اسی حوالے سے ان کے موضوعات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ نئے موضوعات نئی زبان، نئی ہیئت اور نئے فارم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ فارم کا براہِ راست دار و مدار اس بات پر ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے زبان اور فارم کا استعمال کرتا ہے۔ نئے موضوعات میں نہ صرف نئے عہد کے مسائل اور حالات شامل ہوتے ہیں بلکہ اُن کی طرف رجوع کرنے کا فنکارانہ رویّہ بھی شامل ہوتا ہے وہ مختلف واقعات کو ایک خاص تناظر میں دیکھتا ہے اور اس سے متعلق ایک خاص ردِ عمل کا بھی اظہار کرتا ہے۔ جو اس کے رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ فرد معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی تغیرات کے سبب مختلف نوعیت کے تجربات سے دوچار ہوتا ہے یہ تجربات اس کی ذات کا حصّہ بن کے صرف جمع نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کے مختلف اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ مختلف نوعیت کے تجربات میں جو تجربات جس حد تک ایک طرح کے ہوتے ہیں وہ ایک خاص سانچے میں ڈھلتے ہیں اور فرد کی زندگی کا ایک حصّہ بن کے رویے کی تشکیل میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے انفرادی تجربات کے مختلف ہونے کے باوجود ہم بہت سی اشیا اور واقعات سے متعلق ایک سے رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا عہد اور سماج ایک ہے گو کہ ہمارے انفرادی تجربات مختلف ہیں لیکن ان کا زمانی اور سماجی پس منظر کم و بیش ایک ہی ہے اور ہم ایک ہی طرح کے سماجی اور سیاسی سسٹم میں جی رہے ہیں۔

رویّے چونکہ تاثری اور تحریکی تجربات کے ساتھ مل جاتے ہیں اس لیے یہ شخصی خصائص بن جاتے ہیں۔ یہ شخصیت کا اسی طرح حصّہ بن جاتے ہیں جس طرح معاشرتی ماحول میں اشیا اور واقعات مل جاتے ہیں۔ فرد کے رویے میں ایک بے میل پن، ایک بے رنگی DISSONANCE بھی پائی جاتی ہے اور اس بے رنگی سے فرد بے اطمینانی محسوس کرتا ہے اور جب یہ بڑھ جاتی ہے تو اسے کم کرنے کی کوشش کرتا ہے مثلاً آج کے صنعتی دور میں ایک فرد ایک مخصوص قسم کا کام کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کام اس کے مزاج کے مطابق نہیں ہے لیکن وہ اسے کرنے پر مجبور ہے وہ کام نہیں کرے گا تو بھوکا مرے گا..... ایک فرد اپنے گھر سے دور رہنا نہیں چاہتا۔ بیوی بچوں کی محبت اس کے پاؤں کی زنجیر ہے مگر وہ محض "معیارِ زندگی" بلند کرنے کی خاطر سمندر پار سفر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس سے اس کی ذات، شخصیت اور رویے میں ایک تضاد جنم لیتا ہے۔ ذات اور شخصیت کا یہ تضاد جو سرمایہ دارانہ سماج کا بنیادی جوہر ہے آج کی غزل میں نمایاں ہے.....

کتنا بُعد ہے میرے فن اور پیشے کے مابین
باہر دانشور ہوں لیکن مِل میں آئل مین

(تنویر سپرا)

دن بھر تو بچوں کی خاطر میں مزدوری کرتا ہوں
شب کو اپنی غیر مکمل غزلیں پوری کرتا ہوں

(تنویر سپرا)

رات کو دن کے سپنے دیکھوں دن کو بتاؤں سونے میں

میرے لیے کچھ فرق نہیں ہے ہونے اور نہ ہونے میں

(رئیس فروغ)

کربِ خود آگہی میں گزر کر رہے ہیں لوگ
اب جی رہے ہیں لوگ نہ اب مر رہے ہیں لوگ

(عابد حشری)

خود اپنے عشوہ و انداز کا شہید ہوں میں
خود اپنی ذات سے برتی ہے بے رخی میں نے

(جون ایلیا)

یہ روز کس کے تعاقب میں گھر سے جاتا ہوں
یہ روز نت نئے چہرے کہاں سے آتے ہیں
اداسیوں کا سبب کوئی ہو تو بتلائیں
کہ ہم اداس کبھی بے سبب بھی رہتے ہیں

(رسا چغتائی)

یہ عجیب عادت ہے جو بھی حاصلِ جاں ہے
اس سے دور بھی رہنا، دیکھنا بھی حسرت سے

××××××××××××

خود اپنے واسطے جاں کا وبال ہو جاؤں
تھکن کسی کو ہو اور میں نڈھال ہو جاؤں

(صابر ظفر)

ہم جس سماج میں جی رہے ہیں وہاں سرمائے نے ہر شے کو جنس خرید و فروخت میں تبدیل کر دیا ہے مشینوں کے دھوئیں نے انسان کی پرچھائیں تک کو نگل لیا ہے۔ گاؤں سے حصولِ زر کے لیے شہروں کی جانب ہجرت کر رہے ہیں۔ نہ صرف گاؤں سے شہروں کی جانب نقل مکانی ہو رہی ہے۔ بلکہ بہتر مستقبل کے لیے جو موجودہ سماج میں زیادہ سرمایہ جمع کرنے اور کمانے کی صورت میں بہتر ہو سکتا ہے۔ لاکھوں افراد مڈل ایسٹ، یورپ اور امریکہ میں کام کر رہے ہیں۔ سائنس نے انسانی زندگی کو بنیاد سے لے کر انتہا تک تبدیل کر دیا ہے۔ معاملات، ذرائع آمد و رفت اور ذرائع ابلاغ کی ترقی سے زمین سکڑتی جا رہی اب ہر قومی یا ریاستی مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ان تمام تبدیلیوں کے اثرات انسانی زندگی، شخصیت اور ذات پر بھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ کائنات کے بطلیموسی نظریہ کے خاتمے اور فلسفہ سے مابعد الطبعیات کے اخراج نے انسان کو اپنی نظر میں ویسے ہی حقیر بے مایہ اور بے حیثیت کر دیا ہے۔ پہلے وہ اپنی ذات کو اس کائنات کا محور اور ایک بہت بڑا کُل سمجھتا تھا۔ لیکن جدید تصورات کے مطابق زمین کی حیثیت اس وسیع کائنات میں زیادہ نہیں ہے اور انسان اس ذرّے پہ بسنے والا کمزور حقیر سا کیڑا کائنات اور

انسان کے بارے میں تصورات اور حقائق کی تبدیلیوں سے انسان ایک شدید جذباتی اور ہیجانی رد عمل سے دوچار ہوا۔ بہت سے فلسفے اور نظریے اسی رد عمل کا اظہار ہیں اور شاعری بھی چونکہ سماج سے باہر کی چیز نہیں ہے اس لیے شاعری میں بھی مجموعی طور پر ہمیں یہ ردّعمل نظر آتا ہے۔

کوئی بھی معاشرہ ساکن نہیں ہوتا بلکہ تغیّر پذیر ہوتا ہے اور یہ معاشرتی تغیرات افراد کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پیداوار کے لیے ذرائع دریافت کیے جاتے ہیں۔ نئی ایجاد و انکشافات ہوتے ہیں۔ نئے خیالات، تصورات اور رویے اپنائے جاتے ہیں۔ آج اگر ہم ماضی پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہمارا معاشرہ بالکل بدل چکا ہے آج فلم، ویڈیو، ریڈیو، ٹی وی، ٹیلیفون اور کمپیوٹر ہے۔ ریل، کار اور جٹ جہاز ہیں بڑی بڑی عمارتیں اور کثیر القومی صنعتیں ہیں۔ ہم اپنی ضروریات کو مختلف طریقوں سے پوری کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں نئے طریقے ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔ ہمارے طریق عمل کی تبدیلی سے ہماری زندگی، رویے، کردار، تعلقات، رسم و رواج، تصورات و خیالات اور فکر و فن میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ پرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں لے لیتی ہیں۔

طریق زندگی کے تعین میں معاشرتی سرگرمیاں اور رابطے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ محنت کے عمل کے دوران ہی فرد نے بیرونی دنیا کے بعض رابطوں اور اپنی اور دوسرے کام کرنے والوں کی سرگرمیوں کے بعض رابطوں پر عبور حاصل کیا..... جب سے ہمارے آبا و اجداد نے رابطوں پر عبور حاصل کرنا شروع کیا۔ یہ رابطے انسان کی ذہنی سرگرمیوں میں روز افزوں منعکس ہونے لگے ہیں۔ ماحول کا انعکاس، اشیا، لوگوں ان کے عملوں اور رشتوں کی شبیہوں میں بٹ گیا۔ اور خود کا انعکاس۔ اپنے جسم، اس کے حصوں اِن کے باہمی اعمال کی شبیہوں میں، اور آخر میں خود اپنے جذبات کی شبیہوں میں۔ شعور میں ان شبیہوں کے درمیان رشتے، حقیقت میں ان کے اصلی نمونوں کے درمیان رشتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ماحول سے اپنے آپ کو جدا کرنے کی انسان کی صلاحیت سماجی رشتوں کی مرہونِ منّت ہے۔ کسی صورتِ حال سے وہ سب کچھ جدا کرنا جو صرف اس سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے آپ کا (ذات کا) اور بیرونی وجود کی جانب اپنے رویے کا شعور حاصل کرنا، یہ سب انسان دوسرے انسانوں سے مل کر محنت کے عمل کے دوران ان کے ساتھ رشتے قائم کر کے ہی کر سکا ہے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ ذات کا شعور اور بیرونی دنیا کی جانب باشعور روّیہ انسانی ذہنی سرگرمی کو حیوانی جبلی سرگرمی سے ممتاز کرتا ہے۔ تو پھر انسان کے اپنے خیالات احساسات، جذبات و خواہشات وغیرہ کے متعلق سوچنے کی صلاحیت بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے۔ شعور میں نہ صرف ارد گرد کے ماحول اور خود انسان کے جسم کے مادی مظاہر منعکس ہوتے ہیں بلکہ عینی مظاہر بھی خود شعور میں رونما ہوتے ہیں فن کار چونکہ عام افراد سے زیادہ حساس اور باشعور ہوتا ہے اس لیے اس کے فن اور اظہار میں اپنے ماحول اور ذات کا انعکاس شدت سے جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی فن کار کے تخلیقی عمل کے نوعیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "فن کار سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے زمان و مکاں کے کسی نہ کسی دائرہ میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس لیے فن کار کا ہر تجربہ اپنی اوّلین حیثیت میں مادی تجربہ ہوتا ہے۔ جس میں کسی نہ کسی حد تک مقصد اور افادیت ہوتی ہے اس لیے فن کار کا ہر وہ معمولی اور غیر معمولی عمل جس میں مقصد اور افادیت ہو، مادی تجربہ ہوتا ہے۔ جب مادی تجربہ احساس کو بیدار کرنے اور تاثرات کو اُبھارنے کا کام کرتا ہے تو جذباتی تجربے کی منزل میں داخل ہوجاتا ہے۔ جذباتی تجربہ مقصدیت اور افادیت سے خالی ہوتا ہے جذباتی تجربے میں جذباتی خصوصیت ہوتی ہے۔ کسی عمل کی جذباتی خصوصیت ہی اس کو جمالیاتی تجربہ بناتی ہے..... جمالیاتی تجربے

کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ہم مادی تجربے سے گزرے بغیر حاصل کرتے ہیں ..... شاعری ایک فن ہے اس کی حدیں وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں سے مادی علوم و فنون کی حدیں ختم ہوجاتی ہیں اگر ایسا نہ ہو تو ادب اور زندگی کا رشتہ ٹوٹ جائے"

انسان اپنی مادی اور روحانی تخلیقات میں اپنی روحانی سرگرمی کے نتائج کے دوران ٹھوس روپ میں اظہار کر کے ثقافت کو جنم دیتا ہے اور انسان ہی اس کے مطالعے کے دوران ٹھوس صورت کو نظر انداز کر کے ان کے روحانی مافیہ کو اپنے لیے قابلِ فہم بنا کر جذب کرتا ہے۔ معاشرے میں ہمیں نہ صرف تخلیق کا مسلسل عمل دکھائی دیتا ہے بلکہ ثقافت کو جذب کرنے کا عمل بھی نظر آتا ہے جذب کرنے کا عمل انسان اور ثقافت کے درمیان باہمی عمل کا ناگریز پہلو ہے۔ اور معاشرے کی زندگی اور ارتقا کی لازمی شرط ..... روحانی تخلیقات کی ظاہری اور مادی شکل اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ وہ اپنی روحانی ماہیت کا اظہار ہے جسے دوسرا انسان سمجھتا اور ذہن نشین کرسکتا ہے۔ یہ روحانی تخلیقات کی ممتاز خصوصیت ہے۔ ثقافت معاشرے میں مادی اور روحانی قدروں کا معین مجموعہ، ایسا مادی اور روحانی ماحول ہے جس میں انسان رہتے ہیں اور عمل کرتے ہیں لیکن یہ مادی اور روحانی ماحول ہمیشہ یکساں نہیں رہتا ہے۔ اس میں مسلسل تبدیلی آتی رہتی ہے۔ صنعتی اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں اس تبدیلی میں ایک سرعت آگئی ہے بلکہ یہ دور ہی سریع تبدیلی RAPIDCHANGE کا زمانہ ہے۔

زندگی میں رُونما ہونے والی ان تبدیلیوں کے اثرات کو موجودہ ادب میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ناول افسانہ، شاعری مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں تک کہ اردو غزل جس کا کام حسن و عشق کے مضامین باندھنا تھا اس دوران تبدیلیوں کے اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔ آج کی غزل کے تشبیہات، استعاروں اور علامتوں میں جدید صنعتی عہد کے مسائل کی بو باس رچی ہوئی ہے تنویر سپرا کے "لفظ کھردرے" کی تو پوری شاعری ہی صنعتی زندگی اور اور اس کے مسائل کے حوالے سے ہے۔

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کی خرابیوں کو ترقی پسند شعرا نے ایک عرصہ پہلے محسوس کیا تھا۔ ان کے یہاں جدید سرمایہ دارانہ نظام معیشت (بلکہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت) کے خلاف ایک رد عمل یا احتجاج نظر آتا ہے مگر اس احتجاج یا رد عمل کی نوعیت جدید غزل گو شعرا کے احتجاج سے مختلف ہے ترقی پسندوں کے یہاں زیادہ زور اس نظام کے سیاسی رُخ یا خامیوں کی طرف تھا جبکہ جدید شعرا سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی خرابیوں کو ذات اور شخصیت کے پامال ہونے، اخلاقی اور انسانی اقدار کے ریزہ ریزہ ہونے، فرد کا سرمائے کا غلام ہونے کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ فیض کے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" کی نوعیت یہ ہوگئی۔

نگر میں شام ہوگئی ہے کاہش معاش میں
زمیں پہ پھر رہے ہیں لوگ رزق کی تلاش میں
منیر حسن باطنی کو دیکھتا کوئی نہیں
متاعِ چشم کھو گئی لباس کے خراش میں

(منیر نیازی)

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے

بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے

(افتخار عارف)

اندھیرے منہ نکلنا اور گئی شب لوٹ کر آنا
کسے فرصت ہے اب بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھے

(مخلص وجدانی)

تمام راستوں میں خاک اڑا چکا
جمال اپنا رزق میں کما چکا
کہاں کہاں پھرا ہوں بام و در لیے
کہاں کہاں میں بستیاں بسا چکا

(جمال احسانی)

رقص کرنے لگی ہے ٹائپ پر
ترے قدموں کی چاپ دفتر میں
آج پہچانتا نہیں کوئی
میری آواز سے مرے گھر میں

(رسا چغتائی)

سوچا بھی نہ تھا صبح کو میں نکلوں گا گھر سے
اور شام کو گھر جانے کا رستہ نہ ملے گا

(محشر بدایونی)

مل گئی ہے جو تھکن گھر بیٹھے
کس مشقت کا صلہ کہلائے

(رئیس فروغ)

اس قدر تند ہوائیں ہیں کہ دیکھیں نہ سنیں
شل ہوئے ایک ہی پرواز میں بازو کیا کیا

(شہزاد احمد)

جب کہا جاتا ہے MODREN LITERATURE IS ONLY REFLECTION OF MODERN MAN تو ہم پوری طرح جدید ادب کا احاطہ کر لیتے ہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے زیر اثر جوں جوں قدرتی ماحول تبدیل ہوتا جارہا ہے اسی طرح انسان کا نیچر کے ساتھ جو قلبی تعلق تھا نہ صرف یہ کہ بدل گیا ہے بلکہ درہم برہم ہوگیا ہے۔ مستزاد یہ کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ کے مخصوص طبقے کے زیر اثر استعمال نے بھی اس میں ایک بے چینی کو جنم دیا ہے۔ وہ اپنی ذات اور ماحول کے درمیان مغائرت کو دور کرنے میں ناکام رہا ہے نتیجۃً وہ اپنے ارد گرد کی اشیا کو بے معنی اور حقیر سمجھنے لگا ہے۔ ایک اکتاہٹ، بوریت، فرار اور گریز کی

کیفیت اس کی ذات میں پرورش پانے لگی ہے۔

عادت سی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

(منیر نیازی)

گلیوں میں آزار بہت ہے گھر میں جی گھبراتا ہے
ہنگامے سے سناٹے تک میرا حال تماشا ہے

سڑکوں پہ گھومنے کو نکلتے ہیں شام سے
آسیب اپنے کام سے ہم اپنے کام سے

(رئیس فروغ)

حال یہ ہے کہ خواہش پرسشِ حال بھی نہیں
اس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں
غارت روز و شب تو دیکھ، وقت کا یہ غضب تو دیکھ
کل تو نڈھال بھی تھا میں، آج نڈھال بھی نہیں

(جون ایلیا)

صبح کی سیر کی کرتا ہوں تمنا دن بھر
دن نکلتا ہے تو بستر میں پڑا رہتا ہوں

(صابر ظفر)

دل کے ملبے میں دبا جاتا ہوں
زلزلہ کیا میرے اندر آئے

(باقی صدیقی)

کسی انسان کو اپنا نہیں رہنے دیتے
شہر ایسا ہے کہ تنہا نہیں رہنے دیتے
ان سے بچنا کہ بچھاتے ہیں پناہیں پہلے
پھر یہی لوگ کہیں کا نہیں رہنے دیتے

لوگ اس شہر کو خوش حال سمجھتے ہیں
رات کے وقت بھی جو جاگ رہا ہوتا ہے

(صغیر ملال)

قومی زبان (۵۸) نومبر ۱۹۹۴ء

"پہاڑ"

ڈاکٹر الیاس عشقی

لفظوں کی بھی ایک تاریخ اور ایک کہانی ہوتی ہے۔ جو اپنی دلچسپی رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے لفظ پہاڑ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت سی تبدیلیوں سے گزر کر اپنی موجودہ صورت تک پہنچا ہے۔ اس کی روداد مختصراً کچھ اس طرح ہے۔ ہندی کا ایک مشہور دوہا ہے۔

کہت سبے کوی کمل سے، موہت نین "پشانو"

(پشانُ)

نت رک کت ان بنُی لگت اُیجت برہ کرشانو

(کرشانُ)

معنی :۔ سب شاعر کہتے ہیں یہ کنول کی طرح ہیں مگر میرے نزدیک آنکھیں پتھر ہیں (یعنی دوسرے شاعر آنکھوں کو کنول سے تشبیہ دیتے ہیں مگر میں انھیں پتھر سے تشبیہ دیتا ہوں اگر ایسا نہیں ہے) تو پھر کیوں ان دونوں کے لگنے (ٹکرانے) سے محبت کی آگ پیدا ہوتی ہے دو پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاری پیدا ہوتی ہے مگر دو آنکھوں کے ٹکرانے سے دلوں میں محبت کی چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے میرے نزدیک آنکھیں پتھر ہیں..... اسی طرح سورداسی کے ایک مشہور قطعے میں یہ شعر بھی آتا ہے،

"پاہن پتت یان نہیں بیدھت ریتو کرت نسنگ

معنی :۔ پتھر کی سل کو تیر نہیں چھید سکتا تو فضول اپنا ترکش خالی کیوں کر رہا ہے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ایک مشہور بیت کا ایک مصرع یہ ہے۔

پنی بو ذین پاتال میں پھٹ تارین تون

معنی :۔ (اے مالک) تو ایک پتے کو (دریا میں) پاتال تک ڈبو دیتا ہے اور پتھر کو (پانی میں) تیرا دیتا ہے۔

پہلے دوہے میں پشانو (پشانُ) دوسرے شعر میں "پاہن اور شاہ لطیف کے مصرعے میں پھٹ (پھٹر) کے معنی "پتھر" ہیں جو اسی طرح لکھے اور تلفظ کیے جاتے ہیں۔

پشانو (پشانُ) پشانڑ (پشاڑ) معنی پتھر

"پاہن" پاہنڑ (پاھڑ) معنی پتھر

"پھن" "پھنٹر (پھٹ) معنی پتھر

گویا یہ سب ایک ہی لفظ کی مختلف صورتیں ہیں جو کبھی ایک ہی اور کبھی مختلف ہند آریائی زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کو بہ غور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں الف زیر سے اور کہیں زیر الف سے پہلے بدلتا ہے۔ کہیں ھ ش (ش، ھ) سے اور کہیں "ن" "نڑ (ں) سے (اور کہیں نڑ، (ٹ) سے بدلتے ہیں۔ الف کا زبر سے اور زبر کا الف سے بدلتا زبر کا الف سے بدلنا۔ زیر کا "ی" سے اور "ي" کا زیر سے بدلنا عام ہے۔

اب لفظ پاہن کو لیجیے اس کا الف زبر سے بدلا تو یہ پھان (پھانڑ۔ پھاٹ) ہوگیا۔ پھاٹ پھانڑ وہی پشاٹ ہے "ش" کی آواز ھ سے بدلی اور جب پ کا زبر الف سے بدلا تو پاھاٹ (پاھانڑ) ہوگیا جو پتھر کے معنوں میں کئی زبانوں میں موجود ہے اس لفظ میں پھر اک تبدیلی ہوئی۔ غنہ کی آواز دوسرے حروف کی آوازوں سے مل کر نکلتی ہے اس لیے یہ الفاظ میں شامل ہوتی اور ان سے ساقط ہوتی رہی ہے اور اب تو اس کے ساقط ہونے کا رجحان عام ہے اس لفظ میں غنہ کی آواز ڑ سے مخلوط ہے۔ جب ساقط ہوئی تو پاہان جو الف کے زبر سے بدل جانے کی وجہ سے "پھاٹ" (پھانڑ) بن گیا تھا "پہاڑ" کی صورت میں نمودار ہوگیا مگر اب اس کے معنی پتھر نہ رہے پتھر کا منبع یعنی کوسار ہوگئے مگر پتھر سے تعلق باقی رہا۔ یہ ہے لفظ "پہاڑ" کی روداد۔

پہلے ہندی دوہے میں ایک لفظ "بیٹی" وارد ہوا ہے اس کے معنی ہیں دونوں۔ یہ لفظ اودھی زبان میں یا یوں کہیے کہ اودھی اور برج میں (اس لیے کہ تلسی داس کی زبان میں دونوں "بولیاں شامل ہیں) بھی آیا ہے۔ رامائن میں یہ مصرع مشہور ہے۔

بیٹی کشور سب بھانتی سہائے

یہاں بھی بٹی کے معنی "دونوں" ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان زبانوں میں بھی سندھی زبان کی طرح "بہ" کا لفظ دو کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اردو اور دوسری زبانوں میں اس کی موجودگی بارا، بائیس، بتیس، بیالس، باون، باسٹھ، بہتر، بیاسی، بانوے میں۔ "ب" کی صورت میں موجود ہے جس کے معنی دس اور دو بارہ وغیرہ ہوتے ہیں، بھی زبانوں کے اشتراک کی طرف ایک محکم اور واضح اشارہ ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان

کی

تمام مطبوعات

مکتبۂ دانیال وکٹوریہ چیمبرز۔ ۲۔ عبداللہ ہارون روڈ کراچی سے طلب فرمائیے۔

جدید ایرانی ادب سے

خانم نزہت الدولہ

جلال آل احمد / سلیم مظہر

خانم نزہت الدولہ نے اگرچہ اب تک تین شادیاں کیں، پانچ عدد بچے جنے اور دو بیٹیاں دامادوں کے گھروں کو بھیج چکی اور گویا نانی امّاں بن گئی۔ لیکن پھر بھی اس کا خیال ہے کہ جوانی، بڑھاپا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ حق ہمسائے اور سہلیاں، رشتے دار اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ بتاتے ہیں لیکن وہ خود دونوں ہاتھوں سے جوانی کو چمٹی ہوئی ہے اور پھر سے ایک "آئیڈیل شوہر" کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی پھرتی ہے۔

ہر ہفتے بیوٹی پارلر جا کے پیشانی، لبوں کے آس پاس اور آنکھوں کے گرد کی شکنوں پر ماساژ کروا کے بالوں کو نئی نویلی دلہنوں کی طرح سجاتی ہے۔ کھلے سینوں اور تنگ دامن کے بھڑکیلے اور شوخ لباس پہنتی ہے، روزانہ سفید دستانوں کا نیا جوڑا بدلتی ہے اور اپنے بہت ہی قیمتی وقت میں سے تین گھنٹے آئینے کے سامنے گزارتی ہے۔ دس گھنٹے آرام کرتی ہے اور باقی وقت دوستوں اور سہیلیوں سے میل ملاقات میں گزارتی ہے۔ اب کہ سبھی دوستوں، رشتہ داروں اور جان پہچان رکھنے والوں کو پتہ ہے کہ اس کا کسی گھر میں آنا جانا، دکھ سکھ میں شریک ہونا، گھر بدلنے، شادی ہونے یا کسی کے ہاں بچے کی پیدائش پر زچہ و بچہ کے لیے قیمتی تحائف اور پھول لے کے آنا اور نئی نویلی دلہنوں کو اُن کے گھر جا کر منہ دکھائی دینا اور اُنھیں اپنے گھر بلانا..... غرض یہ ساری بھاگ دوڑ کسی نئے آدمی یعنی نئے مرد سے واقف ہونے کے لیے ہے۔ کیونکہ اب دور و نزدیک کے دوستوں، رشتہ داروں میں سے کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں بچا تھا جس نے کم از کم ایک بار خانم نزہت الدولہ کے ہاں اپنا رشتہ بھیج کے ایک "آئیڈیل شوہر" ثابت ہونے کا موقع نہ مانگا ہو۔

خانم نزہت الدولہ ایک سرو قامت خاتون ہے اور یہ کوئی معمولی خوبی نہیں۔ اگرچہ ناک کچھ زیادہ باریک اور..... بس ذرا سی ..... دائیں طرف مائل ہے، لیکن ہر گز گمان نہ کریں کہ ٹیڑھی ہے، بالکل نہیں، اگر ٹیڑھی ہوتی تو وہ فوراً پلاسٹک سرجری کرا کے اُسے سیدھا کرا دیتی۔ صرف ذرا سا..... البتہ عیب نہیں بلکہ وہی کہ دائیں طرف مائل ہے۔ آواز بڑی مترنم ہے، جب بات کرتی ہے تو چہرے پر معمولی سی شکن بھی نہیں لاتی اور ابروؤں اور ہونٹوں کے ارد گرد ذرا سی جنبش نہیں آتی۔ آخر بیوٹی پارلر اور ماساژ کا ماہانہ پانچ سو تومان ایک کھلے ڈلے قہقہے پر تو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اُس کے کانوں کی لوئیں چوڑی ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ خود کان بہت خوبصورت اور نرم ہیں، لیکن افسوس کہ ان میں سے ایک خانم کے خاص ہیئر اسٹائل کے سبب بالوں

کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ گردن ..... البتہ پسر وہی ..... بس ذرا سی لمبی ہے لیکن اس میں رومال باندھنے یا چوڑے سے مفلر کے ایک دو لپیٹے دے دینے سے کسی کو کیا پتہ چلتا ہے۔

پسر، اگرچہ خانم نزہت الدولہ اپنے ماں باپ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی لیکن اُس نے اپنی بڑی بہنوں سے پہلے شادی کرلی اور ان دنوں خود بھی فخر سے کہتی ہے کہ وہ تمام کام پوری سمجھ بوجھ سے کرتی ہے۔ اُس کی ایک بہن کا خاوند وزیر ہے اور دوسری کے خاوند نے چار سال پہلے پاگل خانے میں خودکشی کرلی تھی۔ خانم نزہت الدولہ بیس سال کی نہیں ہوئی تھی کہ خاوند کے گھر جا بسی۔ خاوند اُس وقت وزارت خارجہ کا ایک اعلیٰ افسر تھا، معروف خاندان سے تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ دولت مند تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ عشق و عاشقی نے ان دونوں کو آن ملایا تھا لیکن دراصل دولہا اور دلہن دونوں کے خاندانوں نے ایک دوسرے کو اپنے لیے ضروری سمجھا تھا۔ دولے کا بڑا بھائی وزارت خارجہ میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھا اور خانم نزہت الدولہ کا باپ وزیر داخلہ، یوں انگوٹھی اور نگینہ ایک دوسرے میں فٹ ہوگئے۔ ابھی خانم نزہت الدولہ نے صحیح طور پر عشق و عاشقی اور اپنی پسند کی شادی کا مزہ نہیں چکھا تھا کہ ایک عدد بچے کی ماں بن گئی اور نومولود کی غاں غوں نے شوہر بیوی کے قہقہوں اور مسکراہٹوں کی جگہ لے لی اور ابھی بچہ دو سال کا نہیں ہوا تھا کہ خاوند کو صوبۂ مازندران کا گورنر بنا کے وہاں بھیج دیا گیا۔ خانم کا باپ ابھی زندہ تھا اور بدستور وزیر داخلہ، اور اُسے مازندران میں اپنی زمینیں سنبھالنے اور اُنھیں یکجا کرنے کے لیے اسی داماد جیسے کسی کارآمد اور بااعتماد آدمی کی ضرورت تھی۔ اس نوبیاہتا جوڑے کو مجبوراً چھ سال مازندران میں گزارنے پڑے۔ بالکل صحیح ہے کہ خانم کا خاوند مازندران کا مالک تھا اور پرندوں اور جانوروں سے لے کر انسان تک، پر خانم نزہت الدولہ کا حکم چلتا اور سب کچھ اُسی کے اختیار میں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اب "مرزا منصور خان" خانم نزہت الدولہ کا خاوند اپنے سرکاری کاموں سے اس قدر تھکا ہارا لوٹتا کہ گھر داخل ہوتے ہی اُس میں خانم کو سر سے پاؤں تک چومنے اور اُس کی اداؤں کی تعریفیں کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا اور یوں پردیس میں ناز و نیاز کا سلسلہ ٹھپ ہوگیا تھا۔ چنانچہ مجبوراً بچوں ہی نے ان سب خوشگوار چیزوں کی جگہ لے لی۔ خانم بھی گھر بیٹھے بیٹھے بور ہوگئی تھی، اور اکتاہٹ دور کرنے کے طور پر بس بچے ہی پیدا کرسکی، یعنی مزید تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ ادھر مرزا منصور آہستہ آہستہ گھریلو زندگی میں بھی رسمی ہوتا گیا اور اپنی نازنین بیوی سے بھی وہی سلوک کرنا شروع کردیا جو کسی ماتحت کے ساتھ کیا کرتا۔ اُسے "نزہت" کی بجائے "خانم" کہہ کے بلاتا، نوکرانیوں کے ذریعے خیر خیریت معلوم کرتا اور نہ صرف یہ کہ علاحدہ کمرے میں رہنا شروع کردیا بلکہ اجازت لے کے بیوی کے کمرے میں داخل ہوتا اور اُس سے بھی یہی توقع رکھتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مزید گوارا نہیں تھا کہ اب اُسے صرف "منصور" کہہ کے بلائے، وہ چاہتا تھا کہ گھر میں بھی "جناب عالی" ہی ہو۔ اور یہ سب کچھ خانم نزہت الدولہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا وہ جو اس قدر احساساتی اور معشوقانہ مزاج تھی، اور پردیس میں جبکہ اسے خاوند کے پیار و محبت کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی، گویا بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ مقامی رؤسا اور وڈیروں کی گنوار بیویوں کے ساتھ میل جول کو وہ عار سمجھتی تھی اور پھر عذاب یہ کہ جب کبھی گھر سے باہر نکلتی، سینکڑوں سائل دائیں بائیں جھک جھک کر اس کے صبر کا امتحان لیتے رہتے۔ اور یہ اُس کے لیے ایک اور مصیبت تھی۔ لیکن خانم نزہت الدولہ نے پھر بھی صبر کیا۔ صحیح ہے کہ خاوند کا تبادلہ کرانے کے لیے اپنے باپ کو کئی خط لکھے لیکن باپ نے اس پر واضح کردیا تھا کہ بکھری ہوئی املاک کا یکجا ہونا اُس کی ازدواجی زندگی سے زیادہ اہم ہے، وہ خود بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس لیے خاموش ہوگئی تھی اور اپنے طور طریقے پر تہران، وہاں کی اشرافی محفلوں، سہلیوں کے ساتھ اپنی تفریحی سرگرمیوں اور دعوتوں میں جانے آنے کو بہلانا شروع کردیا تھا کہ دفعتاً اُس کے خاوند کو مرکز میں

طلب کر لیا گیا بلکہ لوگوں کے بقول معتوب قرار دے دیا گیا۔ خانم نے اس واقعے کو ذرا بھی اہمیت نہ دی دراصل وہ شروع ہی سے ان باتوں سے بے نیاز تھی اور کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ خلاصہ چھ سال کی پردیس، تنہائی اور گھٹن کے بعد ایک بار پھر اپنے آپ کو سہیلیوں اور دوستوں میں محسوس کرنے لگی۔ زندگی میں پھر سے رونق اور بہار آگئی۔ پارٹیوں میں دوستوں کی محفلوں کو اپنے شوہر کے اکڑفوں اور مازندرانی خواتین کی نقلوں اور اُن کے بارے میں چند دلچسپ لطیفوں سے گرماتی۔ اپنی کزنوں اور نوبیاہتا سہیلیوں سے اُن کی ازدواجی زندگی کے رنگین قصے سُن سُن کر کڑھتی رہتی اور اُسے احساس ہوتا کہ اُس کا شوہر کسی قدر بے ذوق اور خشک مزاج اور اُس سے اور اُس کے آئیڈیل شوہر کے تصور سے کتنا دور ہے۔ خاص کر جب اُس کا بہنوئی وزیر بنا تھا خانم نزہت الدولہ اس محرومیت کے رجحان کو نظر انداز نہیں کر پا رہی تھی۔ چنانچہ نئی ڈیوٹی کے منتظر شوہر کو طعنے دینا اور بات بے بات اُس سے الجھنا شروع کر دیا۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ ایک رات بستر میں جب اُن کا کام ختم ہوا تو اُس نے خاوند سے پوچھا "منصور راضی ہوگئے؟" خاوند نے بھی بجائے رورعایت اور کسی لحاظ کے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا "انسان بیت الخلاء بھی جائے تو راضی ہی ہوجاتا ہے۔ گویا یہ خانم کے برداشت کے لیے انتہا تھی۔ پس اُس نے اسی رات فیصلہ کر لیا اور اگلے روز گھر اور نوسالہ ازدواجی زندگی کو ٹھوکر مار کے باپ کے گھر آگئی۔ خانم کے والد کو بھی اپنے ایک معتوب داماد سے کوئی زیادہ ہمدردی نہیں تھی۔ لیکن اس نے جس قدر اصرار کیا کہ بچوں کو اس سے لے لیں، خانم کی کھوپڑی میں کسی طرح بھی یہ بات نہ بیٹھی غرض بچے دے کے حق مہر کے ساتھ خانم کی طلاق لے لی گئی۔

خانم نزہت الدولہ نے جب پہلی بار شادی کی تھی تو شاید اُسے علم نہیں تھا کہ ایک آئیڈیل شوہر میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں لیکن پہلے شوہر سے طلاق لینے کے بعد کم از کم یہ جان گئی تھی کہ اُس میں کیا کیا خامیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ اُس کے خیال میں شوہر جوان ہو، دولت مند ہو، خشک مزاج اور رسمی نہ ہو۔ بے شرم اور ڈھیٹ بھی نہ ہو، سرکاری کارندہ نہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر میں داخل ہوتے ہی سر کی چوٹی سے ناخنوں تک اُسے بوسے دے۔ اب طلاق لے کے اپنے طور پر مطمئن ہوگئی تھی اور آئیڈیل شوہر تک پہنچنے کے لیے روز بروز جوان ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہر مہینے وزن کراتی، اپنے سینے کی پیمائش کے مطابق، سوئٹزرلینڈ کی مشہور کمپنیوں سے آرڈر پر تیار کیے گئے، مختلف ڈیزائنوں کے بریزئر استعمال کرتی۔ جدید ترین فیشن، میک اپ، لپ اسٹک اور نیل پالش ..... وغیرہ کے بارے میں نئی نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے صبح و شام یورپ ٹیلیفون کرتی رہتی۔ کوئی پارٹی مس نہ کرتی، خود بھی ڈنرز اور پارٹیاں دیتی، چھٹیوں کے دنوں میں باپ کی وزارت کی سرکاری گاڑیوں پر سہیلیوں کو ساتھ لے کے سیروں پہ چلی جاتی۔ سابقہ شوہر سے لیے گئے حق مہر کی وجہ سے خانم کے پاس اس قدر دولت آگئی تھی کہ ہر مہینے اکیس جوڑے کپڑوں کے سلواتی اور نیا جوتا خریدتی۔ دراصل اکیس کے عدد کے ساتھ اُسے خاص تعلق ہوگیا تھا۔ نوسالہ ازدواجی زندگی کے دوران میں بھی اُسے اس کا کئی بار احساس ہوا۔ مہینے کی اکیس تاریخ کو اس نے شادی کی تھی، اکیس ہی کو طلاق لی اور پھر اسی تاریخ ہی کو دوسرے شوہر کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

خانم نزہت الدولہ کا دوسرا شوہر ایک نیلی آنکھوں والا تنومند فوجی افسر تھا جس کے کندھوں پر خوبصورت سنہری بیجز سجے ہوئے تھے۔ چونکہ حال ہی میں وہ جنوبِ ایران میں ایک بڑی مہم سر کر کے آیا تھا اس لیے دھوپ کی وجہ سے چہرہ قدرے سنولایا ہوا تھا، اگلے سال ہی اُس نے میجر بن جانا تھا۔ اگرچہ اُس کا خاندانی پس منظر کوئی زیادہ قابل تعریف نہیں تھا، لیکن آرمی سروسز کلب میں خانم نزہت الدولہ نے اُسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی گویا فیصلہ کر لیا تھا۔ خاندان والے اور عزیز رشتے دار اس قسم کی

شادی کے مخالف تھے۔ لیکن بوڑھے باپ نے یہ سوچ کر کہ اُس کے آنکھیں بند کر لینے کے بعد ایک مردہ وزیر کی بیٹیاں گھر بیٹھی کڑھتی رہیں گی خاموشی سے نکاح کے دو بول پڑھوا کے بیٹی رخصت کر دی اور اس مصلحت کے پیشِ نظر کہ لوگوں کے ذہنوں سے بات آئی گئی ہو جائے دولہا دلہن کو دو تین ماہ کے لیے ابواز بھیج دیا۔ اس اثنا میں نہ جانے کس کو بھنک پڑی اور اُس نے فوراً ہی بات خانم کے والد تک پہنچائی اور سارے عزیز رشتہ دار سر پیٹ کے رہ گئے، اور بالآخر بات کھل گئی کہ خانم نزہت الدولہ کے "آئیڈیل شوہر" کی خود اُسی تہران میں دو اور بیویاں ہیں۔ اس سارے مسئلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود دولہا میاں تیسری شادی کے ہنی مون پر تھے اور یوں صورتِ حال کی وضاحت کرنے سے قاصر۔ بالآخر بڑی بوڑھیوں نے ایک مہینے کی چھان پھٹک اور جوتے گھسا کے ان دو بیویوں کے گھروں کے پتے تو کیا نکاح خوان اور نکاح رجسٹر کے اندراجات نمبر تک ڈھونڈ نکالے۔ دولہا دلہن اس سب کچھ سے بے خبر ہنی مون منا کے گھر لوٹے تو یہ قصہ اُنھیں سنایا گیا۔ خانم نزہت الدولہ اپنی اس شادی پر اس قدر خوش تھی اور یہ تین مہینے اس کیف و سرور میں گزرے تھے کہ اسے اس بات کا سرے سے یقین ہی نہ آیا۔ بالآخر نکاح نامے دکھا کر کے اُس کا شک دور کیا گیا۔ لیکن یہ شوہر دوسری بیویوں کو تو کیا خود خانم کو بھی طلاق دینے پر تیار نہیں تھا۔ فوجی تھا اور ڈھیٹ پسر ملک کے جنوبی علاقوں میں حال ہی میں سر انجام دیے گئے کارناموں کی وجہ سے اُس کا سینہ تعریفی پٹیوں اور بیجز سے رنگین تھا اور وہ انھیں بیجز اور پٹیوں کے بل بوتے پر ملک کے وزیر داخلہ کے سامنے اڑ گیا۔ ٹھیک ہے کہ اس دفعہ بھی خاموشی کے ساتھ خانم نزہت الدولہ کی طلاق لے لی گئی لیکن افسری اور بیجز اپنا کام دکھا گئے اور خانم کا حق مہر برباد ہو گیا۔

اگرچہ خانم نزہت الدولہ اس مسئلے سے نمٹ کر مزید تجربہ کار ہو گئی لیکن دل کے کسی گوشے میں نیلی آنکھوں والے تنومند فوجی افسر کی آرزو ابھی تک موجود تھی پسر دلچسپ یہ کہ خانم اب بھی ایک آئیڈیل شوہر کو پانے کے لیے بے تاب تھی۔ جس جگہ وہ تشریف فرما ہوتی وہاں کا موضوع آئیڈیل شوہر اور اس کی خصوصیات ہوتیں۔ یہ واقعہ بھی جلد ہی فراموش ہو گیا البتہ خانم ایک تجربہ کار اور سرد و گرم ازدواج چشیدہ خاتون سمجھی جانے لگیں۔ نئی نویلی دلہنیں اور لڑکیاں بالیاں اپنی بڑی بہنوں اور ماؤں کی بجائے خانم کی نصیحتوں کو غور سے سنتیں اور ازدواجی زندگی کے معاملات میں اُس سے ایک تجربہ کار اور صاحبِ نظر کے طور پر مشورے لیتیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خود خانم نزہت الدولہ بھی کسی ایسے موضوع پر جان دیتی تھی۔

خانم کو اپنے خاندان اور گرد و نواح کی بال بچوں والی عورتوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور راز و نیاز کرنے سے وحشت تھی دراصل وہ خود کو اُن کی صف میں شامل نہیں کرانا چاہتی تھی۔ اپنے بچوں کو بھی ایک عرصے سے چھوڑ چکی تھی۔ خود سے مشورہ کرنے والی سبھی نوجوان لڑکیوں کو اپنی بہنیں سمجھتی اور بہت خلوص سے انھیں بتاتی تھی کہ شوہر وہ ہو جو بیوی سے عشق کرتا ہو، وفادار ہو، سرکاری کارندہ نہ ہو، بے شرم و بے حیا نہ ہو، تنومند و خوبصورت ہو، باوقار خاندان سے ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نیلی آنکھوں والا ہو۔ البتہ خانم نزہت الدولہ کے یہ نظریات کسی علم و استعداد کے سبب نہیں تھے کیونکہ اس نے گھر پر پڑھا جانے والے ایک اُستاد سے صرف ابتدائی سطح تک پڑھا تھا۔ بہن کا وزیر شوہر بھی کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ بس پہلے شوہر نے ذرا بری تربیت پائی تھی، وہ "سن لوئی" اسکول کا پڑھا ہوا تھا اور دو سال انگلینڈ رہ آیا تھا۔

دوسری طلاق لیے دو تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ خانم کا باپ فوت ہو گیا۔ پورے اعزاز، فوجی بینڈز اور مسجد سپہ سالار میں ختم و دعا کے ساتھ اُسے دفن کیا گیا۔ بہن، بھائی جائیداد اور وراثت کی تقسیم سے فارغ ہی ہو پائے تھے کہ "شہریور" ماہ کی اکیس تاریخ آ گئی۔ خانم نزہت الدولہ کا پہلا شوہر جو سابقہ دور میں معتوب تھا اب وزیر خارجہ بن چکا تھا اور محفلیں ایسے نو دولتیوں سے پر

رونق تھیں جنھوں نے کوٹھیاں بنگلے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ وردی پوش چپڑاسیوں کو پہلی نظر میں کسی یورپی ملک کا سفیر سمجھ کر اُس کے آگے جھکتے رہتے۔ ان حالات میں خانم زنہت الدولہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک فرنشڈ گھر لیا، نئی گاڑی خریدی اور ہر بدھ کو ڈنر دینے کا اعلان کیا گویا معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی سابقہ شوہر اور نئے وزیر خارجہ کی طرف ثالث بھیجے اور بچوں، نواسوں اور پوتوں پوتیوں کو دیکھنے کے بہانے چوری چھپے، اُس کے اور شادی شدہ بیٹیوں کے گھر آنا جانا بھی رکھا اور جال پھینکتی رہی۔ کاش کہ والد صاحب فوت نہ ہو چکے تھے ورنہ دو تین دنوں میں مسئلہ حل تھا لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ باپ فوت ہو چکا تھا بلکہ اشرافی محفلوں کی ہوا بھی بدل گئی تھی۔ لوگ ناآشنا تھے پرانے دوستوں کی خبر ہی نہیں تھی۔ خانم کو یہ سب کچھ عجیب لگتا اور دکھ ہوتا کہ کوئی "آئیڈیل" شوہر کے بارے میں اُس کی بات ہی نہیں سنتا۔ سبھی لوگ ذاتی آزادی کے لیے فکر مند، جائیدادیں چھڑانے کے لیے بے تاب اور ڈنر پارٹیوں کے متلاشی تھے یا گندم اور جو فروشی کے لائسنسوں کے لیے سرگرداں یا پھر سیاسی پارٹیوں اور اخبارات کے چکروں میں پھنسے ہوئے تھے۔ بہرحال اسی بھیڑ بھاڑ اور دھکم پیل میں اور اُنھیں نودولتیوں میں سے، جشنِ مشروطیت کی رات خانم کی اپنے تیسرے شوہر سے ملاقات ہوئی۔

خانم زنہت الدولہ کا تیسرا شوہر عرب ایران کے ایک بڑے قبیلے کا سردار تھا جو حال ہی میں جلاوطنی اور قید کاٹ کے لوٹا تھا اور اب پارلیمنٹ کا ممبر بن کے تہران آیا تھا۔ وہ چوڑے سینے والا تھا ذرا سا پینڈو بھی لگتا تھا اور نفاست اور اس قسم کی چیزوں سے کوسوں دور تھا لیکن جوان تھا، اسمبلی کا ممبر تھا اور پورے ایک قبیلے کا مالک پھر یہ کہ دولت والا تھا۔ یہ گویا صحیح معنوں میں خانم زنہت الدولہ کا "آئیڈیل شوہر" تھا۔ گرمیوں کے موسم میں آبائی گاؤں جانا، گھڑسواری کرنا، مردوں کی طرح کندھے پر بندوق لٹکانا، جوگرز بوٹ پہننا، سردیوں میں ڈنرز اور پارٹیوں پر ممبران اسمبلی اور وزراء کے ساتھ شخصی آزادی، سیاسی پارٹیوں اور حکومت اور ملت کے مستقبل کے بارے میں گفتگوئیں اور بحث کرنا..... گویا زندگی کا مزہ ہی آجائے گا۔ خانم چونکہ نکاح و طلاق کے معاملات میں خاصی تجربہ کار ہو چکی تھی اس لیے اب کی بار ہر پہلو پر نظر رکھی۔ اکثر اپنے وزیر بہنوئی کے گھر ملاقاتیں رکھتی۔ ساری گفتگوئیں مکمل طور پر رسمی انداز میں ہوئیں اور معاملات دو ٹوک طریقے سے طے پا گئے۔ پروگرام بنا کہ سردار صاحب حال ہی میں گاؤں سے آئی ہوئی اپنی بہن کو ساتھ لا کے باقاعدہ طور پر وزیر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کے ہاں رشتہ، مانگنے آئیں، شرائط طے ہوں اور پھر دعائے خیر ہو، چنانچہ ایسا کیا گیا اور جب سب کچھ طے پا گیا تو پھر خانم کو چھپ کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی، پس وہ تشریف لائیں اور محفل خصوصی نوعیت کی ہو گئی سردار صاحب کی بہن نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والی بلند قامت، نوجوان اور بہت ہی خوبصورت عورت تھی، اور جونہی خانم زنہت الدولہ آئی، بطور ہونے والی نند کے اُس کے ساتھ حسد اور کینے کی بجائے وہ خانم پر قربان اور واری ہونے لگی۔ خانم کی چائے میں چینی ڈالی، اُس کو پھل پیش کیے، بالوں کی سیٹنگ اور اسٹائل کی تعریف کی اور اُس درزی کا پتہ لیا جس کا خوبصورت سلا ہوا سوٹ خانم نے پہنا ہوا تھا۔ خلاصہ یہ کہ وہ اس قدر خانم کے صدقے واری ہوئی کہ مبہوت رہ گئی۔ یہ موسم بہار کے اواخر کا ایک دن تھا اور قرار پایا کہ جب تک سردار صاحب حکومت سے باقاعدہ ضبط شدہ املاک واپس لیتے ہیں اور تہران میں مکمل طور پر سیٹ ہوتے ہیں تب تک خانم شمیران کے علاقے میں کسی پُرسکون اور خنک جگہ پر ایک کوٹھی کرائے پر لے لیں، تاکہ گرمیاں وہاں گزاریں اور موسم خزاں میں شہر لوٹ کے آئیں گے، اُس وقت سردار صاحب کی املاک کا مسئلہ بھی حل ہو چکا ہوگا۔ اور وہ شہر میں ذاتی مکان لے لیں گے۔ حق مہر اور دیگر معاملات پر بھی اُنھوں نے کوئی سخت مؤقف اختیار نہ کیا، کیونکہ خانم زنہت الدولہ کا بہنوئی وزیر تھا اور اُسے اسمبلی میں قبیلے کے کسی سردار ممبر اسمبلی کی بہرحال ضرورت تھی اگرچہ

بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی بہن نے ایک لاکھ تومان حق مہر کو کچھ کم کرنے کا کہا۔ لیکن سردار صاحب دل ہار بیٹھے تھے۔ حتیٰ کہ اُس نے وعدہ کیا وہ جلد ہی گھر کے کام کاج کرنے کے لیے گاؤں سے قبیلے کے ستر مرد اور عورتیں بلوا لے گا اور خانم کو گھر کے کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دے گا۔ آخر کار شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور ایک دوسرے کے مُنہ میں مٹھائی رکھی گئی اور یوں دولے والے خوشی خوشی رخصت ہو کے گھر گئے۔

خانم نزہت الدولہ کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے، ایک ہفتے میں اپنے شہر والے گھر کو کرائے پر دیا اور شمیران میں ایک بڑے باغ والا بنگلہ کرائے پر لیا اور تیسرے "آئیڈیل شوہر" کے ساتھ شادی کرنے کے سلسلے میں نکاح کے روز کے انتظامات میں مصروف ہوگئی۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلینڈ میں مقیم اپنے ایک بھانجے کے توسط سے عروسی جوڑا منگوایا جس کا گھیرا اکیس میٹر تھا۔ وزراء، عمائدین شہر اور ممبران اسمبلی میں سے چار سو اکیس افراد کو رسم عروسی سے دو ہفتے پہلے دعوت نامے پہنچوائے اور تہران کے دو عظیم ہوٹلوں کو شادی کی شام مہمانوں کی پذیرائی کے لیے ریزرو کرا دیا اور "کیٹرا کمپنی"، کہ جس میں خود خانم نزہت الدولہ اور اُس کے بہنوئی کا حصہ تھا، کے ٹرک پورے تین دن مرغ، گوشت، سبزی، پھل اور مشروب شمیران پہنچاتے رہے۔ خلاصہ یہ کہ کہیں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آخر اپنا آئیڈیل شوہر جو پالیا تھا۔ نئے شادی شدہ جوڑوں کو کہتی پھرتی تھی کہ اگر انسان باپ کی وراثت کو آئیڈیل شوہر پانے کے لیے خرچ نہ کرے تو پھر کیا کرے گا۔

شادی کا کیا پر شکوہ جشن تھا۔ اوائل گرما کی ایک چاندنی رات اور ملائم ہوا چل رہی تھی۔ دو دن پہلے پانی کے بڑے پائپوں سے گھر کے باغ کے تمام درختوں کو دھو دیا گیا اور اُن کی تمام شاخوں پر رنگ برنگی ڈیکوریشن لائٹس اور قمقمے لگا دیے گئے تھے۔ فوارے چل رہے تھے اور ملک کے دو مشہور آرکسٹرا گروپس کی موسیقی پر نئے بنائے گئے ایک سو پچاس جوڑوں کی گنجائش والے ڈانسنگ ہال میں ڈانس ہو رہا تھا۔ چاندی کے خوبصورت پیمانوں کے ساتھ فینسی جاموں میں شراب انڈیلی جا رہی تھی۔ کھانے کے لیے میزوں پر روسٹ کی گئی مرغابیاں رکھی ہوئی تھیں۔ "خاویار" (مچھلی) اور سویٹ ڈشز ایسی چیزیں تھیں جن کی طرف کوئی دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ ڈنر کی میز کو "T" کی صورت میں لگایا گیا تھا اور اُس کی لمبائی اکیس میٹر تھی۔ دلہا دلہن ایک میز کے پیچھے اصفہان کی نفیس خاتم کاری کی گئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شہنشاہی گیت کے ساتھ ڈنر کا آغاز کیا گیا۔ جناب وزیر اعظم، اسپیکر اسمبلی اور دلہا دلہن کے خاندان کی طرف سے مسجّع و مقفّیٰ اور پر شکوہ تہنیتی تقریریں ہوئیں۔ حاضرین و شرکاء نے بار بار ملک و ملت کی طرف سے دلہا دلہن اُور اُن کے عالی مرتبت خاندانوں کو مبارک بادیں دیں اور اس بندھن کو ملک و ملت کی خوشحالی اور ترقی کے لیے نیک فال قرار دیتے ہوئے دلہا دلہن کی سلامتی کے نام پر جام چڑھائے۔ یہ پر شکوہ جشن بڑے احترام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، اس طرح سے کہ نہ کسی نے حد سے زیادہ مستی کی اور نہ ہی کوئی جام ٹوٹا۔ باغ کے داخلی دروازے کے بائیں طرف رکھی ہوئی ایک بڑی میز پر مہمانوں کے قیمتی تحائف اور خوبصورت گلدستوں کا ایک بڑا ڈھیر لگ گیا تھا۔ اسی رات نئی دوستیاں وجود میں آئیں اور پرانی کدورتیں ایک دوسرے کے جاموں میں بہائی گئیں اور حتیٰ کہ اسی ہفتے اسمبلی میں حکومت کے خلاف پیش ہونے والی ایک وضاحتی قرارداد جشن ہی میں ختم ہوگئی۔ بس ذرا سی مشکل آئی وہ یہ کہ اسی رات گھر کو چور پڑ گئے۔ اور صبح جاگنے پر گھر والوں کو پتہ چلا کہ تمام ہیرے جواہر، تمام سونا چاندی، نفیس اور قیمتی پردے دلہا دلہن کی کرسیوں کے نیچے بچھائے گئے دو قیمتی قالین اور مہمانوں کی طرف سے دیے گئے تمام تحائف چور لے گئے۔ جشن عروسی رات کے تین بجے تک جاری رہا تھا اور نوکر، چوکیدار..... وغیرہ بھی جاموں کی تلچھٹ خالی کر کر کے مخمور ہوگئے تھے، یوں چور حضرات کی عید ہوگئی۔

اس سب کچھ کے باجود دلہا دلہن نے اگلے دن سے ایک خوش و خرم زندگی کا آغاز کیا۔ یہ اپنی جگہ پر کہ خانم نزہت الدولہ کے وزیر بہنوئی نے حتیٰ کہ کابینہ کی ایک خصوصی میٹنگ میں یہ مسئلہ اٹھایا لیکن جشن عروسی کی رات بننے والی دوستیوں کے باوجود، قریب تھا کہ خانم نزہت الدولہ کا شوہر اسمبلی میں لاقانونیت اور عدم تحفظ کے مسئلے پر حکومت کے خلاف وضاحتی قرار داد لائے پر مسئلہ اس طرح رفع دفع کیا گیا کہ علاقے کے مہتمم پولیس کو تبدیل کر دیا گیا اور ساتھ ہی نئے مہتمم نے شمیران کے تھانوں کی تعداد میں اضافے کے علاوہ وہاں پر پولیس گشت لگا دیا۔ ادھر سردار صاحب نے بھی خانم کے جہیز کے ساتھ آنے والے باورچی سے لے کر مالی تک سبھی ملازمین کو نکال باہر کیا اور ٹیلیگرام کر کے فوری طور پر اپنے گاؤں سے سات خدمت گار بلا لئے، خانم نزہت الدولہ کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔ اُس نے اس واردات کو اپنے سردار صاحب کے بندھن کا صدقہ قرار دیا اور پھر یہ کہ دلہا خانم کی محبت میں اس قدر دیوانہ تھا کہ اُسے چوری شدہ مال کا افسوس ہی نہ ہوا۔ اُس نے خانم کو کسی گھریلو کام کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیا۔ اُس کے ٹوتھ برش پر خود ہی پیسٹ لگاتا باتھ کے شاور اور ٹب کے پانی کو بھی وہ ہی ٹھنڈا اور گرم کرتا خانم کے منہ میں اپنے ہاتھ سے نوالے رکھتا، حتیٰ کہ اُس کے لباس کے بند تک بھی اپنے ہاتھوں سے باندھتا۔ خلاصہ یہ کہ اُس نے دو ہفتے کے لیے اسمبلی سے چھٹی لے لی تھی اور ملنے جلنے والوں پر گھر کے دروازے بند کر کے دلہن بیگم کے پہلو میں بیٹھ گیا گھر کے سب کام کاج کی خود ہی دیکھ بھال شروع کر دی اور خانم کو کانچ کی گڑیا سے زیادہ نفاست اور پیار سے رکھا۔ اِدھر خانم نے بھی اپنا شہر والا گھر بیچ کے چوری ہو جانے والے سامان کی جگہ نئے سامان سے گھر کو سجا دیا۔ قالین، فرنیچر اور پردے ..... ہر ایک گویا عجائب گھروں کی زینت تھے۔ ہر کمرے کا علاحدہ ویڈیو، ٹی وی، فریج اور ائیر کنڈیشنر ..... تھا اور دلہا دلہن کو جو چیز ضرورت پڑ سکتی تھی وہ نزدیک ترین فاصلے پر مہیا تھی۔ اس آدھے ہنی مون میں سارے کام سردار صاحب کے ذمے تھے۔ وہ نوکرانیوں کو ڈانٹتا پھرتا مالیوں کو نئے موسموں کے پھول پودے لگانے کے لیے کہتا۔ بجلی، ٹیلیفون اور گیس کے بل گھر کا کرایہ ادا کیا حتیٰ کہ مالک مکان کے مرکزی ریکارڈ آفس محکمہ بجلی و پانی کے ساتھ نکاسی آب کے مسئلے پر اُس کی مدد کر کے، بغیر پیسے دیے تین ماہ کی ادائیگی کرایہ کی رسید لے لی اور دسترخوان پر خانم کو تحفے کے طور پر پیش کی۔ چونکہ پندرہ دن کی چھٹی ختم ہونے والی تھی، اس لیے اُسی دسترخوان پر خانم سے کہا کہ کیسا ہے اگر ہم بہن کو بھی بلا لیں تاکہ وہ گرمیاں ہمارے ساتھ آ کے گزاریں۔ اور خانم نزہت الدولہ کو آنے والی تنہائی کا اندیشہ تھا اور پھر نند کی محبت بھی نہیں بھولی تھی اس لیے فوراً راضی ہو گئی۔ اور خاوند کی چھٹی ختم ہونے سے اگلے دن سب کام نند کے ذمے ہو گئے اور خانم نزہت الدولہ واقعتاً صرف اور صرف ایک دلہن تھی۔ صبح سے شام تک اپنا وقت آئینے کے سامنے، حمام میں یا ڈائننگ ٹیبل پر گزارتی۔ بیوٹی کنسلٹنٹ اور ماساژ کرنے والی کو گھر پر بلواتی اور انہی کے مشوروں پر خام گوشت اور سُرخ ٹماٹر اپنے رخساروں پر رکھے رہتی اور ہرگز گھر سے باہر نہ نکلتی اور کان اپنی نند کے ان خوبصورت جملوں کے عادی ہو گئے تھے! واہ! واہ کیا ملائم جلد، کیا چہرے کی شادابی، کتنے اونچے نصیب ہیں میرے بھائی کے۔ اور پھر روزانہ سو بار بلکہ ہزار بار خانم نزہت الدولہ واقعی جوان ہو گئی تھی۔ جوان اور فرمانبردار شوہر، آرام ہی آرام، صبح سے شام تک اپنی تعریفیں سننا، سرخ ٹماٹر ..... وغیرہ رخساروں پر رکھے رہنا، کیا کیف و سرور کے دن تھے۔

ایک مہینے پلک جھپکتے ہی گزر گیا، اگرچہ سردار صاحب ذرا کمزور ہو گئے، لیکن خانم نزہت الدولہ نے اس ایک مہینے جیسا لطف زندگی بھر نہیں اٹھایا تھا۔ اپنی شادی کے دوسرے مہینے کے پہلے دن سے خاوند بیوی نے مبارک باد دینے آنے والوں کے ہاں دعوتوں پر جانا شروع کر دیا۔ ہر روز دو تین دوستوں کے ہاں جا سکتے لیکن اتنی جلدی یہ سلسلہ کہاں ختم ہونا تھا۔ سب سے بڑی

مشکل یہ کہ خانم نزہت الدولہ تھک جاتی۔ دوسرا تیسرا دن تھا کہ خانم کی اُس بہن کے گھر گئے، جو وزیر کی بیوی تھی اور اُن کے بے حد اصرار پر رات وہیں رہ گئے۔ وزیر صاحب کو ممبر اسمبلی سے بہت سی باتیں کرنی تھیں اور بہنیں بھی جیسے مدتوں بعد ملی ہوں۔ کون سا موضوع تھا جس پر بات نہ ہوئی ہو غرض دو بجے تک جاگتی رہیں اور عہد پیمان، رازو نیاز اور آئندہ کے پروگرام و منصوبے ..... اور پھر سو گئیں۔ صبح ابھی خانم نزہت الدولہ بستر سے باہر نہیں نکلی تھی کہ شوہر کو ٹیلیفون پر بلایا گیا جی ہاں! پھر چوری ہو گئی۔ جناب سردار کی بہن کو ایک کمرے میں بند کر کے لاک کر دیا ہے۔ ٹیلیفون کی تاریں کاٹ دی ہیں۔ اور ساتوں ملازموں کے ہاتھ پاؤں باندھ کے انھیں سٹور میں بند کر دیا ہے اور جو کچھ گھر میں تھا بڑے قالینوں، شمعدانوں اور بھاری فانوسوں سے لے کر فرنیچر، فریج، ویڈیو، ٹی وی اور ڈیک ..... تک سب کچھ اٹھا کے لے گئے ہیں، خلاصہ یہ کہ گھر کو ننگا کر گئے ہیں۔ خانم نزہت الدولہ تو اپنی جگہ پر اُس کا شوہر ٹیلیفون سنتے ہی ہل گیا اور وہیں گھٹنے ٹیک دیے چوروں کی طرف سے واحد نشانی باغ کی ریت پر ٹرکوں کے نشانات تھے فوراً اخبارات میں مہتمم پولیس پر بھرپور تنقید ہونے لگی کہ ایک مہینے کے عرصے میں ممبر اسمبلی کے گھر دو دفعہ چوری ہو گئی اور پولیس سوتی رہی۔ کم از کم مطلوبہ تعداد یعنی پندرہ نمائندوں کے دستخطوں کے ساتھ حکومت کے خلاف ایک اور قرارداد اسمبلی میں پیش ہونے والی تھی کہ وزیر داخلہ نے چوری کی واردات کے ایک ہفتے بعد ایک ماہرانہ چال سے نئے دلہا یعنی سردار قبیلہ کو تحفظ فراہم کرنے کی سہولت واپس لینے کا بل اسمبلی میں پیش کر دیا۔ ملک کے عوام اس سب کچھ پر حیران تھے اور اُنھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ روس کی کارستانی ہے یا انگلینڈ یا امریکہ کی سیاست .....؟ اور آخر یہ جنجال کہاں سے اُٹھ رہا ہے۔

اِدھر چوری کی آخری واردات کے دوسرے دن خانم نزہت الدولہ کے سابقہ ملازمین جو جہیز کے ہمراہ تھے اور جنھیں سردار صاحب نے نکال باہر کیا تھا، خانم کی بہن کے گھر آئے اور سردار صاحب اور اُس کی نیلی آنکھوں والی بہن کے بارے میں اپنا شک ظاہر کیا، عصر کے وقت تک خانم نزہت الدولہ کا سارا خاندان حرکت میں آ چکا تھا۔ بڑی بوڑھیوں کی مدد سے سردار صاحب کی بہن کی دو دن ٹوہ لگائی گئی اور اس طرح عین الدولہ روڈ پر اُس کے گھر کا سراغ مل گیا۔ اور اگلے دن خاندان کی ایک منہ بولی اور تجربہ کار بہن "تیرے صدقے جاؤں، شام کا وقت ہے، مری نماز قضا ہو رہی ہے" کے بہانے گھر کے ایک ملازم کو چکر دے کے، اندر داخل ہو گئی اور وضو کر کے حوض کے کنارے نماز پڑھتے ہوئے کھڑکیوں کے شیشوں سے خانم نزہت الدولہ کے ایک ایک صوفے اور سامان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور پھر گھر کی ایک نوکرانی کے ساتھ زمانے کی خرابی اور اہلِ زمانہ کی بے ایمانیوں کا رونا، رونا شروع کر دیا اور دکھ سکھ بانٹتے ہوئے نوکرانی سے یہ انکشاف کرا لیا کہ گھر کی مالکہ بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک نہایت مہربان عورت ہے جو ایک قبیلے کے سردار کی بیوی ہے۔ اُسی رات ہی وزیر داخلہ نے حکم دیا کہ علاقہ پولیس سردار صاحب کے گھر چھاپہ مار کے خانم کا مسروقہ سامان برآمد کرے اور تمام واقعے کی فائل بنا کے اسمبلی میں پیش کی جائے۔ اگرچہ پہلی چوری کے ہیرے جواہرات سونا چاندی اور نفیس پردوں ..... وغیرہ کا کوئی سراغ نہ ملا لیکن دوسری چوری کا سارا سامان برآمد ہو گیا۔ اِدھر سردار صاحب نے پولیس کے اس اقدام کو اپنے پارلیمانی استحقاق کے خلاف سمجھتے ہوئے حکومت کے خلاف اسمبلی میں تحریک استحقاق پیش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر کے ممبران سے دستخط کرانے شروع کر دیے تھے کہ پولیس آفیسرز، جائے وقوعہ کے اردگرد کی کوٹھیوں کے ملازمین اور اہلِ محلہ پر مشتمل اکیس آدمیوں کی شہادتوں اور بیانات کی فائل کے ساتھ حکومت کی طرف سے سردار صاحب کو تحفظ کی سہولت واپس لینے کا بل مع قرارداد مذمت کے اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔ اب کہ ایک آئینی

بحران پیدا ہونے کے ساتھ عجیب رسوائی ہونے والی تھی کہ اراکین حکومت نے مداخلت کر کے دونوں فریقوں کی طرف سے تحریک اور بل اسمبلی میں پیش نہ کرنے کی شرط پر سردار صاحب اور جناب وزیر داخلہ کے درمیان صلح کرادی۔ خانم نزہت الدولہ کا حق مہر بھی معاہدۂ صلح کی نذر ہوا۔ اب کی بار طلاق لیتے ہوئے خانم نزہت الدولہ کا سر اس احساس کے سبب فخر سے بلند تھا کہ وہ بس ملک و قوم کی عزت و آبرو کے لیے ایثار کرتے ہوئے اپنے تیسرے اور آئیڈیل شوہر سے محروم ہو رہی ہے۔

اس تیسرے تجربے سے خانم نزہت الدولہ مزید گھاگھ ہو کے نکلی اور اُس کا یہ نظریہ اور بھی پختہ ہوا کہ جوانی بڑھاپا خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے اور وہ ابھی تک ایک آئیڈیل شوہر کی جستجو میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہی ہے۔ شہر والا گھر پھر سے خرید لیا ہے، اُس میں جدید ترین فرنیچر اور قالین بھی جمع کر دیے ہیں ماہانہ پانچ سو تومان چہرے اور سینے کی ماساژ پر خرچ کرنے لگی ہے۔ ہر ہفتے بالوں کا رنگ تبدیل کراتی ہے، کھلے سینے کے بھڑکیلے اور شوخ لباس پہنتی ہے اور جب بات کرتی ہے تو ہرگز ماتھے پر شکن نہیں ڈالتی، مسکراتے ہوئے بھی ابروؤں اور کنارِ لب پر جنبش تک نہیں آتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک عمر گزارنے اور تین شادیاں کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اس کا آئیڈیل شوہر ان نو دولتیوں اور نیچ قسم کے لوگوں میں سے نہیں ہونا چاہیے اور دوسرا اُس میں یہ احساس پختہ ہو رہا ہے کہ آئیڈیل شوہر کے راستے میں واحد رکاوٹ وہ معمولی عیب ہے جو اس کی ناک میں ہے اور آج کل اس فکر میں ہے کہ پلاسٹک سرجری کرا کے یہ عیب بھی نکلوا دے۔

جلال آل احمد کے افسانوں کے مجموعے "زن زیادی"، چاپ دوم، ۱۳۷۱ھ خ/۱۳۸۱ھ خ، انتشارات فردوس، تہران (ص ۴۷-۶۶) سے انتخاب کر کے ترجمہ کیا گیا جلال آل احمد انقلاب اسلامی ایران سے پہلے کے افسانہ نگاروں میں سے ہے۔

بابائے اردو یادگاری خطبہ

تنقید اور جدید اردو تنقید

مصنف

ڈاکٹر وزیر آغا

قیمت = ۵۰/ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

پنجابی سے ترجمہ

''سرمایۂ الہام''

(حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے حکمت بھرے اشلوک)

اُردو ترجمہ: ارشد محمود ناشاد

(۱)

شیخ فریدؒ! لڑیں جو تجھ سے اُن سے تو مَت لڑ
اُلٹا، چوم کے اُن کے پاؤں، آجا اپنے گھر

(۲)

شیخ فریدؒ! انھیں روکیں اور لاکھ انھیں سمجھائیں
جن کو شیطاں نے بہکایا، سیدھی راہ نہ پائیں

(۳)

شیخ فریدؒ! اگر ہے تیرے من میں رب کی آس
عجز میں اِتنا کامل ہوجا، جوں رستے کی گھاس

(۴)

شیخ فریدؒ! بُرا مت کہنا خاک کا اونچا درجہ
جیتے بوجھ سہارے تیرا، موت کے بعد ہے پردا

(۵)

شیخ فریدؒ! نہ پوری ہوگی تیرے من کی آس
جنگل، بیلے تو رب ڈھونڈھے، رب ہے تیرے پاس

جدید فارسی ادب

دیہاتی

م۔ ایمان / معین نظامی

مَیں جتنی عبادت گاہوں کو بھی جانتا ہوں
تیرے سرسبز ہاتھ
اُن سب سے زیادہ، چُوم لیے جانے کے قابل ہیں
تیرے ہاتھ کا کُھردرا سا نشان
ایک چھوٹا سا دل ہے، جس میں زندگی دھڑک رہی ہے
تیرا مغرور گیت
گندم کے سُنہری کھیتوں کی خوشبو کو
اس طرح گنگناتا ہے
کہ چھوٹی چھوٹی ندّیاں
اسے اپنے نیلے ذہن میں حفظ کر لیتی ہیں
اور نجابت سے لبریز تیری آنکھیں
سُورج کے لیے میری بہترین تشبیہ ہیں
تو زمین سے بھی زیادہ مہربان ہے!

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

"آشوبِ میکدہ"

پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر

صفحات ۴۰۲ قیمت = /۲۲۵ روپے

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران - ۱۷۸۸ - بی - خانیوال روڈ، ملتان

اٹھارویں صدی عیسوی میں جب سلطنتِ مغلیہ زوال پذیر اور پوری ہندوستانی قوم منتشر اور پریشان تھی اُس زمانہ کے کئی شعرا نے شہر آشوب اور دہرِ آشوب لکھے تھے جن میں اُس دور کی زبوں حالی کی کیفیت بیان کی تھی۔ اُن میں شیخ ظہور الدین حاتم کا دہر آشوب جس کا عنوان بارہ صدی ہے، محمد شاہ کے شروع دور کی عکاسی کرتا ہے اور محمد شاکر ناجی کا شہر آشوب اور مرزا رفیع سودا کے تحریر کردہ شہر آشوب کو محمد شاہ کے دورِ آخر اور احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے زمانوں کی بدحالی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ پھر جنگِ آزادی ۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کو جن حالات سے گزرنا پڑا تھا اُس سے متاثر ہو کر خواجہ الطاف حسین حالی نے مسدس "مدو جزرِ اسلام" لکھی تھی۔ آشوب میکدہ اِسی نوع کی ایک طویل نظم ہے۔ محترم ڈاکٹر برہان احمد کی تحریر کے مطابق یہاں میکدہ سے شاعر کی مراد سارا عالم ہے۔ اس لحاظ سے اس طویل نظم کو موجودہ صدی کا دہر آشوب کہنا مناسب ہے۔ آج پوری دنیا جس آشوب سے گزر رہی ہے اس کو عوام و خواص سب محسوس کر رہے ہیں اور اگرچہ جو لوگ اِس فساد کے بانی ہیں وہ اِسے ترقی و تہذیب کا نام دے رہے ہیں لیکن اُن کا یہ دعویٰ "برعکس نہند نام زنگی کافور" کا مصداق ہے۔ اور اِس طرح ہٹ دھرمی سے کام لے کر وہ حقائق کو جھٹلا نہیں سکتے۔ کون سی بُرائی ہے جو اِس زمانہ میں موجود نہیں۔ انسانیت پڑی سسک رہی ہے محبّت، مروت، اخوت، ہمدردی وغیرہ پُرانے زمانہ کی اصطلاحیں معلوم ہونے لگی ہیں۔ افلاس، بے روزگاری، بے ایمانی، دغا بازی، بے غیرتی، بے حیائی، اور مار کاٹ اور فتنہ و فساد کی ایسی گرم بازاری ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اِس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے ان ہی حالات سے متاثر ہو کر یہ طویل نظم لکھی ہے اور اپنی شاعرانہ صلاحیت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ وہ حالی کی مسدس سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اس لیے انھوں نے بیشتر اُن ہی کا تتبع کیا ہے، صرف نظم کی ہیئت مختلف ہے۔ علاوہ ازیں حالی کے پیشِ نظر محض مسلمانوں کا عروج و زوال تھا لہذا اُنھوں نے خود کو دورِ عروج تک محدود رکھا۔ صفدر صاحب نے آشوب دہر پر اظہار خیال کیا ہے اِس لیے اُنھوں نے جملہ اقوام کے ماضی کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ آخر میں حالی کی طرح اُنھوں نے بھی ایک

روشن مستقبل کی نوید سنائی ہے۔ چونکہ نظم کا تخاطب عوام و خواص سے ہے لہذا زبان کو سہل اور سادہ اور اندازِ بیان کو ژولیدگی سے پاک رکھا ہے۔ خدا کرے اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ بات دوسروں کے قلوب میں اُتر جائے۔

(ثناء الحق صدیقی)

"کرن کرن اُجالا"

رشیدہ عیاں

صفحات ۱۸۴ قیمت دس امریکی ڈالر

مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز ۲ عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

"کرن کرن اُجالا" رشیدہ عیاں کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اِس میں صرف اُن کی غزلیں شامل ہیں، اِس شعری مجموعے کے لیے مجروح سلطانپوری، محشر بدایونی، سرشار صدیقی اور سیّد عاشور کاظمی نے تعارفی کلمات لکھے ہیں۔ ان سے رشیدہ عیاں کی شعری شخصیت اُجاگر ہوتی ہے۔ لیکن اِن کا سب سے اہم تعارف اِس کتاب کی پہلی غزل ہے جس کے تمام اشعار اُن کی شخصیت کے الگ الگ رُخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سچائی کے اصول پہ جب سے اُڑی ہوں میں
سُنسان دشتِ زیست میں تنہا کھڑی ہوں میں

یہ شعر سچائی سے اُن کی پرستاری ظاہر کرتا ہے۔ جو سچائی کے مقابلے میں اڑے رہنے کی حد تک سنجیدہ ہو اُسے دشتِ زیست میں تنہائی کے سوا کیا حاصل ہوگا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اِس شعر سے پسپائی ظاہر نہیں ہوتی ہے۔

پرچھائیاں گر آج حوالہ ہیں ذات کا
خوش ہوں کہ اپنے سائے میں خود سے بڑی ہوں میں

پرچھائیاں اگر ذات کا حوالہ ہیں تو شاعرہ اِس بات پر خوش ہے، کہ سائے کا وقت بدلتا رہتا ہے، کبھی وہ ذات کے برابر ہوتا ہے، کبھی ذات سے چھوٹا لیکن ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب سائے کا قد ذات سے بڑا ہوجاتا ہے یہ وہ لمحہ ہے جب شاعرہ کے اندر خوشی و طمانیت سر اٹھاتی ہے اور احساسِ قد آوری پیدا ہوتا ہے،

توڑو نہ یوں مجھے کہ عمارت ہی گر پڑے
اقدار کے ستونوں کی لازم کڑی ہوں میں

یہاں شاعرہ ستون پر ضرب لگانے والوں کو متنبہ کر رہی ہے کہ عمارت کی زبان میں تعمیر کی اساس ستون ہیں، کچھ ستون کی خاص اہمیت ہوتی ہے، اور کچھ کی حیثیت امدادی! شعر کا متکلم خود کو لازم کڑی تصور کرتا ہے۔

پیوند نسلِ نو کو سلف سے کیے رہی
اِن دو صدوں کے بیچ کی محکم کڑی ہوں میں

یہاں شاعرہ خود کو اُس نسل میں شمار کر رہی ہیں جو قدیم و جدید کے درمیان پل کا کام دیتی ہے اگر ہم اس پُل کو سنگم مان لیں تو پھر دونوں رنگوں کو ایک سنگم میں بہتے دیکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس پُل پہ سفر کرنے یا اس سنگم میں رواں ہونے والی شاعرہ

کے کلام میں، صورتِ حال، امتزاجی رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جب ہم رشیدہ عیاں صاحبہ کی شاعری کا اس کلیہ کو پیشِ نظر رکھ کر نظارہ کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ رشیدہ عیاں کا ڈکشن اور لفظوں کی نشست و برخاست جدید ہے لیکن شائستگی و سلامت روی قدیم ہے۔ اور اُن رنگوں کے ملاپ کا نام "کرن کرن اُجالا" ہے۔ حرفِ آخر کے طور پر یہ بیان کرتا چلوں کہ رشیدہ عیاں انسان کی توقیر چاہتی ہیں اور انسان کی توقیر وہیں ہوگی جہاں سچ کا بول بالا ہوگا۔ سچّا معاشرہ دُنیا بھر کی خوبصورتی کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے۔

کتاب اچھی چھپی ہے، البتہ پروف ریڈنگ میں دو ایک جگہ سقم نظر آیا ہے۔

ا۔ س

"اساس"

سرشار صدیقی

صفحات ۱۲۰ قیمت =/۶۰ روپے غیر مجلد =/۵۰ روپے

اثاثۂ ناشرین ادب جی پی او بکس نمبر ۳۱۶، کوئٹہ پاکستان

"اساس" معروف شاعر سرشار صدیقی کی تصنیف ہے۔ سرشار شاعری میں اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں، تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کو "شعرِ عقیدت" کہا ہے، لیکن یہ کتاب مجموعۂ حمد، مجموعۂ نعت، اور مجموعۂ منقبت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے،

عام طور پر "حمد و نعت" غزل کے فارم میں پیش کی جاتی ہے، لیکن سرشار نے اظہارِ عقیدت کے لیے نظمیہ قالب کا انتخاب کیا ہے۔ اور نہایت کامیاب رہے ہیں۔ اس سے قطع نظر، سرشار اپنی دوسری نظموں میں بھی اِس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کی نظم گوئی سے ہٹ کر پیرایہ اختیار کیا جائے اُن کا سب سے ہٹ کر شعر کہنے کا یہی روّیہ "اساس" میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

شاعری کے حوالے سے بھی، اور حمد و نعت کے حوالے سے بھی یہ پوری کتاب پڑھنے کے قابل ہے، ہر نظم پیرایہ بیان کے لحاظ سے ایک نیا جلوہ دکھلاتی ہے۔ اور شاعر کے اظہار و بیان پر قدرتِ کاملہ کا پتا دیتی۔ ذرا اِس حمدیہ نظم کو دیکھیے۔

صبح ازل کیا
شام ابد کیا
قیدِ مکاں کیا
وقت کی حد کیا
تو ان سب سے بالاتر ہے
تو ہی مخفی تو ہی خبر ہے
سب چہرے تیرے ہی چہرے
سارے نام ترے ہی نام
تو خود ہی اپنا شہکار

تو خود ہی اپنا انعام

حمد کے بعد نعت کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

محمد کا مسلک

ہر ابہام سے

سارے شبہات سے پاک ہے

اور قرآن

یعنی کتاب جلیل

اِس کی وحدانیت اور یکتائی کی ایک روشن دلیل!

"اساس" نہ صرف یہ کہ حمد، نعت، منقبت اور وابستگان رسول (ﷺ) کے ذکر سے آراستہ ایک خوش نما گلدستہ ہے بلکہ نظموں کا ایک بھرپور مجموعہ بھی ہے۔ اس کتاب کو دونوں حیثیتوں سے پڑھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر طویل گفتگو کی جائے لیکن یہاں اس کی گنجائش کم ہے آخر میں یہ کہتا چلوں کہ پوری کتاب میں جستہ جستہ روحِ اسلام داخل ہو گئی ہے۔

"احمد فراز نمبر"

مرتبین: زیتون بانو تاج سعید (کتابی سائز)

صفحات ۶۵۶ قیمت = /۲۰۰ روپے

مکتبۂ ارژنگ پشاور

تاج سعید کو کسی شخصیت پر ضخیم نمبر ترتیب دینے کا ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ ادب کے قارئین اِس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انھوں نے اپنے ادارے مکتبۂ ارژنگ سے وقتاً فوقتاً جو معرکتہ آلارا نمبر شائع کیے ہیں اُن میں مجید امجد پر "لوحِ دل" "مجید امجد شخص و شاعر"، "راجندر سنگھ فن اور شخصیت"، "ممتاز شیریں فن و شخصیت" اور "قند کا ڈراما نمبر وغیرہ ہیں۔ اِس سلسلے کی تازہ کڑی احمد فراز نمبر ہے۔

اِس نمبر کی ترتیبِ مضامین پر نظر ڈالنے سے جو پہلا خوش کن تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے فاضل مرتب نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھا ہے۔ اِس کا آغاز وزیر اعظم پاکستان محترمہ بینظیر بھٹو کے پیغام سے ہوتا ہے۔ جس میں اُن کی طرف سے احمد فراز کے مزاحمتی کلام اور انقلابی شاعری کو سراہا گیا ہے، جو آمریت کو للکارنے میں صرف ہوا تھا۔

احمد فراز نمبر میں اُن کی شخصیت و فن کے حوالے سے جو مضامین شامل ہیں اُن کے لیے حسبِ ذیل عنوانات قائم کیے ہیں۔ (۱) میزانِ تنقید (۲) تجزیے، مطالعے (۳) ثبت است بر جریدۂ عالم دوام تو (۴) ناخن کا قرض (۵) عکسِ گفتگو (۶) منظوم خراج عقیدت (۷) اور آخر میں "انتخابِ کلام" جناب افتخار عارف نے کیا ہے یہ انتخاب ایک اچھے شاعر کا دوسرے اچھے شاعر کو خراج تحسین ہے۔

مذکورہ عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اُن سے احمد فراز کی شخصیت و فن کے محاسن جستہ جستہ سامنے آکر ایک دلاویز

شاعرانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان عنوانات کے تحت جن اہلِ قلم نے اظہار خیال کیا ہے اُن میں سبھی جانے پہچانے ہیں، بعضوں کی ناقدانہ حیثیت مسلم ہے۔

زیتون بانو نے احمد فراز کا بائیو ڈاٹا مرتب کیا ہے بائیو ڈاٹا کے بغیر شخصیت نگاری میں کسی بات کی کمی رہ جاتی ہے یوں سمجھیں بائیو ڈاٹا ذاتی کوائف میں، پیشانی کا درجہ رکھتا ہے۔

"انٹرویوز" کی شمولیت سے اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ انٹرویوز کے ذریعے ایک فرد کی ذات سے پردہ ہٹتا ہے، اور بعض سوالات ذات کے کونے کھدرے تک پہنچ کر اپنے حسبِ منشا انکشافات کی مسرت بن کر وارد ہوتے ہیں۔

احمد فراز نمبر میں کچھ صفحات تصاویر کے لیے مختص کیے گئے ہیں ان سے احمد فراز کی شخصیت کے کچھ اور گوشے روشن ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی مرتبین کی کوششیں کامیاب ہیں کتابی سائز میں یہ نمبر صوری و معنوی دونوں لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔

ا۔ س

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اردو ادب کی تحریکیں

امیر خسرو سے لے کر عہدِ حاضر تک اردو ادب کی اہم تحریک کا تجزیہ اس کتاب پر مصنف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان اور ایم اے اردو کے چوتھے پرچے کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

چند مندرجات

ریختہ کی دو تحریکیں
علی گڑھ تحریک
رومانوی تحریک
اقبال کی تحریک
ایہام کی تحریک
فورٹ ولیم کالج
ترقی پسند تحریک
اسلامی ادب کی تحریک
اصلاحِ زبان کی تحریک
انجمن پنجاب کی تحریک
حلقۂ اربابِ ذوق
ارضی ثقافتی تحریک

قیمت:۔/۱۵۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی۔ ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

مضمون نگار حضرات اپنا مکمل پتا مضمون کی پشت پر لکھ دیا کریں

قومی زبان (۷۶) نومبر ۱۹۹۴ء

کچھ وقت غیر ملکی کتابوں کے ساتھ

ڈاکٹر انور سدید

اردو کی چند نایاب مثنویاں ..... ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

اُردو میں مثنوی نگاری فارسی شعر و ادب کی عطا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُردو ادب میں اس صنفِ سخن کو فردوسی، مولانا روم اور نظامی گنجوی کی مثنویوں سے فروغ حاصل ہوا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ بیسویں صدی میں مثنوی نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ سحر البیان مصنفہ سیّد میر حسن اور گلزارِ نسیم مصنفہ دیا شنکر نسیم کو اردو ادب میں جاوداں حیثیت حاصل ہے اور ان کا مطالعہ اب بھی اس دور کے تہذیبی نقوش سے متعارف کرا دیتا ہے۔ بیسویں صدی میں صنفِ ادب زندہ رہی اور انھیں دو کلاسیکی کتب کے باعث مثنوی کے مباحث اُبھرتے رہے۔

اُردو زبان کی ابتدائی شاعری جنوبی ہند میں پروان چڑھی تھی، نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو دکن میں مثنوی نگاری کا نقطۂ آغاز شمار کیا جاتا ہے۔ اس ابتدائی دور میں ایک شاعر کمال خاں رستمی تھے۔ جنھوں نے ۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی "خاور نامہ" تصنیف کی۔ وجہی، ابن نشاطی، غواصی، مقیمی، نصرتی، میراں جی شمس العشاق، قربی، باقر آگاہ، ملک خوش نود، احسن شوقی، شیخ محمود اور متعدد دوسرے شعرا نے مثنوی کے ابتدائی نقوش آراستہ کیے، عبدالقادر سروری نے اس صنفِ سخن کے ارتقا کے آثار تلاش کیے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ مثنویوں کا سراغ لگایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے "شمالی ہند کی اردو مثنویاں" کے نام سے اس صنف کی ایک مخصوص علاقائی تاریخ مرتّب کی،

اردو مثنوی کے محققین کی اس مختصر سے جماعت میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کی شرکت بے حد خوش آئند معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اس عدم دستیاب ذخیرے کی تلاش و جستجو کا بیڑہ اُٹھایا تو متعدد نوادر تلاش کر لینے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی زیرِ نظر کتاب "اردو کی چند نایاب مثنویاں" گیارہ ایسی مثنویوں کا تذکرہ ہے جن میں دو مثنویاں "چندر بدن مہیار" اور **مثنوی اعجاز رقم** یعنی خمسۂ باطن تو مطبوعہ ہیں۔ لیکن نو مثنویاں تا حال قلمی نسخوں کی صورت میں بمبئی کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب چند ایسی نایاب مثنویوں کا تعارف کراتی ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مثنوی کا تعارف کراتے وقت اس کہانی کا اجمال بھی پیش کیا ہے جس پر مثنوی استوار ہوئی ہے اور اس

کے علاقے کے جغرافیائی اور تاریخی حالات بھی پیش کر دیے ہیں جن میں یہ کہانی پروان چڑھی تھی اور پھر ان ماخذات تک بھی رسائی کی کاوش کی ہے جن سے گزر کر کہانی مثنوی نگار تک پہنچی۔ حامد اللہ ندوی نے یہ شیرازہ بندی بڑی کاوش سے کی ہے۔ انھوں نے بکھرے ہوئے مواد کو نہ صرف جمع کیا بلکہ اس کی ترتیب و تدوین بھی اس انداز میں کی کہ قاری اس کتاب کے مطالعے میں مگن ہوجاتا ہے۔ اور تحقیق کی اس کتاب کو یوں پڑھتا ہے جیسے وہ نوادرات کا عجائب گھر دیکھ رہا ہو۔

مثنوی "دولہ سجن" سورت کے ایک گمنام مکین اللہ مکین کی تخلیق ہے۔ اگرچہ یہ مثنوی زیادہ قدیم نہیں۔ یہ ایک علاقے میں لکھی گئی، جہاں اردو کو فروغ حاصل نہیں تھا۔ لیکن مین نے حسن و عشق کی یہ کہانی مثنوی میں اس خوش اسلوبی سے پیش کی کہ اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کتاب اردو کے فروغ میں بھی معاون ثابت ہوئی، مثنوی "ہیرالال" میں جو کہانی پیش کی گئی ہے یہ اس لحاظ سے انوکھی ہے کہ اس کے دو مرکزی کردار دو مختلف زبانوں میں مکالمہ کرتے ہیں۔ اس میں ہیرو پٹھان ہے اور ہیروئن برہمن زادی ہے۔ لاگ اور لگاوٹ کا ایک مکالمہ حسب ذیل ہے۔

لال۔

ارے نازنیں نکتہ بازی نہ کر
سخن کو ہمارے توں ماضی نہ کر
ترے بن مجھے کچھ سجھاتا نہیں
تجے اب لیے بن میں جاتا نہیں

ہیرا۔

ارے چل پروشوں کرے چھے گمان
کہ سپھاٹو چھے نیمو، نہ ٹوٹے کمان
چھے چاندوت ماں راد رانا توراج
جٹی آبرو موت آوے چھے آج

(ارے پرے ہٹ سمجھتا کیا ہے۔ نیمبو پھٹا ہوا ہے۔ کمان ٹوٹ جائے گی۔ چاندوت میں رانا راؤ کا راج ہے۔ خواہ مخواہ رسوا ہوگا اور جان بھی جائے گی۔)

مثنوی "سیہ پوش" کے مصنف شاہ رحمان دکن کے ممتاز شاعر سوقی کے معاصر تھے۔ انھوں نے یہ مثنوی سلطان محمود غزنوی کے دور کے ایک واقعے پر لکھی ہے لیکن عشق و عاشقی کا یہ واقعہ فرضی معلوم ہوتا ہے لیکن بیان اس قدر دلگداز ہے کہ قاری اس سے خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔

مثنوی "بی بی سلونی" کا مصنّف حاجی خلیفہ خاکی تھا اور اس نے یہ مثنوی ۱۷۶۸ء میں مکمّل کی۔ شاعر نے اسے ایک داستان گو کے انداز میں لکھا۔ مجلس آرائی کی ایک کیفیت یوں ہے:

اے بھائی گھر والے میاں گرما گرم قہوہ پلا
قصہ میں چھیڑا ہوں نیا، آواز نئیں سوکا گلا
تو خوب گراب روشنی، پھولوں کے گجرے ہار ڈال

کر پان حقّے سے مگن، مجلس کا جی ہووے خوشحال

مثنوی "بی بی ارواح" کے شاعر محمد شفیع بن عبدالعزیز کے حالات کسی تذکرے میں دستیاب نہیں۔ مصنّف نے اس مثنوی کے پلاٹ سے تصوّف کے مسائل کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ "لیلیٰ مجنوں" کے مقبولِ عام قصے کو ایک گمنام شاعر رحمت نے مثنوی کا موضوع بنایا ہے۔ یہ مثنوی نظروں سے اوجھل تھی۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے اس کی دریافت میں اوّلیت حاصل کی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ حامد اللہ ندوی کو نہ شہرت کی خواہش ہے اور نہ وہ اپنے نام کی بے جا نمائش کے آرزومند ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مومن نے لکھا ہے کہ ندوی صاحب کی ان اقدار سے گہری وابستگی ہے جو ہماری علمی اور تہذیبی روایت کی امین رہی ہیں انھوں نے اپنی زندگانی کا بیشتر حصّہ انجمن اسلام اور ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی لائبریری میں بسر کیا اور نہ صرف طالبان علم کی راہنمائی کی بلکہ علمی تحقیق کو خود بھی آگے بڑھایا۔ زیر نظر کتاب ان کی علمی اور ادبی جستجو کا قیمتی ثمر ہے۔ یہ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

تلاش و تعبیر ..... رشید حسن خان

جناب رشید حسن خان کا نام آئے تو پورا ادبی کردار ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یہ مستقل مزاجی سے کام کرنے والے محنت کش فرہاد کا کردار ہے جو کہ تلاشِ حقیقت کے لیے عمر بھر تیشۂ قلم چلا سکتا ہے۔ ان کی جاں ہار محنت کے نقوش "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کی تدوینِ نو اور تحشیہ نگاری سے عیاں ہیں، زیرِ نظر کتاب "تلاش و تعبیر" جو مجھے جناب بشیر حسین میواتی، نے فراہم کی ہے ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے لیکن ان میں کوئی مضمون ایسا نہیں جو پروفیسر رشید حسن کے خان خانی مزاج کی نمائندگی نہ کرتا ہو اور صداقت کو جملہ کانٹوں کے ساتھ منظر پر پیش کرتا ہو۔

"حرفِ آغاز" میں ہی انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ سخن فہمی اور طرف داری میں تضاد کی نسبت تو نہیں ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ طرف داری کی دشمن ہوتی ہے۔ اور اچھے خاصے مردِ معقول کو اپنے چھوٹے سے دائرے کا قیدی بنا لیا کرتی ہے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ نظریہ ایک طرح کا نظام جبر ہوتا ہے جس میں بس وسعتِ زنجیر تک آزادی کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

رشید حسن خان کا ادبی مؤقف یہ ہے کہ آدمی جس زبان میں شعر کہے وہ اس زبان کے اسالیبِ بیان کا مزاج داں بھی ہو۔ شاعری بیان کا حسن بھی چاہتی ہے۔ وہ ادب کو انفرادی کارناموں کا مجموعہ تسلیم کرتے ہیں اور غزل کی عظمت کے ساتھ نظم کی وسعت کو بھی قبول کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب اگرچہ ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن ان مضامین کی کرنیں جس چراغ سے ہوئی ہیں اس کا نام رشید حسن خاں ہے۔ چنانچہ آپ ان کا مضمون "فانی ..... شہیدِ احساس" پڑھیں یا "سیماب کی غزلیہ شاعری"، "مومن کی پے چیدہ بیانی"، "معراج نامۂ ناسخ" یا جوہر کی شاعری "زیر مطالعہ لائیں، آپ فوراً پہچان جائیں گے کہ ان پر رشید حسن خاں کے دستخط ثبت ہیں اور وہ روشِ عام سے ہٹ کر وہ بات لکھ رہے ہیں جو ان کی اپنی ہے۔ ان کے اپنے ذہن سے اتری ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کو ایک جذباتی راہنما ثابت کیا ہے تو شدّتِ جذبات کا جوہر ان کی شاعری میں بھی تلاش کیا ہے لیکن رشید حسن خاں کا فیصلہ یہ ہے۔

"محمد علی جوہر کو بیان کا ایسا پیرایہ نہیں مل سکا جو جذبے اور احساس کو محفوظ رکھ سکے اور دیرپا بنا سکے..... ان کی شاعری کا زیادہ حصّہ ایسا ہے جو آج پہلے کی طرح متاثر نہیں کر پاتا"

جعفر زٹلی کی شاعری پر زٹل کا لیبل لگا ہوا ہے۔ انھیں سنجیدہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔ رشید حسن خاں نے انھیں ادبی تاریخ میں بحال کرنے کی بے حد سنجیدہ کوشش کی ہے اور لکھا ہے۔

"اس نے اپنے زمانے کے آلام و مصائب کو دیدہ وری کے ساتھ پیش کیا۔ ارتقائے زبان کے نقطۂ نظر سے بھی اس کا کلام کام کی چیز ہے۔ وہ دہلی کے شعرا میں تقدم زمانی کا شرف رکھتا ہے اور یہ بات فخر سے کہی جا سکتی ہے کہ شمالی ہند کے ایک قدیم شاعر کا کلام خیالی مضامین کے بجائے واقعات کا روزنامچہ ہے۔"

اسی زاویے سے رشید حسن خاں کے مضامین فانی، مومن اور سیماب پر پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان پر بھی جداگانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ان شاعروں کو مقبولِ عام فیصلوں سے نکال کر نئی روشنی میں لانے کی سعی کی گئی ہے۔ اس کتاب کے دو مضامین "دُہرا کردار" اور "ادب و صحافت" موجودہ دور کے سماجی اور ادبی رویّوں پر بے لاگ مگر معرکہ آرا تبصرے ہیں۔ جنھیں پڑھنے سے روشنی بھی ملتی ہے اور راہنمائی بھی۔ رشید حسن خاں کی یہ کتاب مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۵ سے دستیاب ہے۔

مامن ..... امین صدیقی

مالی گاؤں کے ممتاز شاعر امین صدیقی کی کتاب "مامن" کا مطالعہ کرنے سے پہلے ان کے بارے میں جو چند باتیں میرے ذہن میں ڈالی گئی تھیں وہ یہ تھیں۔

(۱) امین صدیقی کی شاعری نصب العین سے والہانہ وابستگی کی شاعری ہے۔

(۲) اس شعری مجموعے (مامن) کو شکیب جلالی اور اقبال ساجد کی جدید تر نسل کا پھیلاؤ کہنا چاہیے۔

(۳) امین صدیقی پر ترقی پسندی یا جدیدیت پسندی کا لیبل لگانا مشکل ہے کیوں کہ اس میں ترقی پسندی کے محاسن بھی موجود ہیں اور جدیدیت کے بھی۔

یہ سب باتیں کسی کتاب کی دیباچہ نگاری کے آداب و اطوار کے عین مطابق ہیں، ان میں اثبات بھی موجود ہے اور مہذّب انکار کی صورت بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کبھی شاعر کو "زنداں" سے نجات دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور کبھی اسے پھر کسی "خانے" میں بند کرنے کی جسارت بھی کر ڈالی گئی ہے۔ لیکن مجھے امین صدیقی ایک ایسے شاعر نظر آئے جو اپنے اندر کی آواز سننے پر قادر ہیں، وہ چشم بنیار رکھتے ہیں اور زمانے کو دیکھتے چلے جاتے ہیں، مجھے ان کے ہاں مشاہدے کی چالاکی نظر نہیں آتی ہاں نظارے کی حیرت معصوم سی حیرت ضرور نظر آتی ہے۔ وہ چونکہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں سانس لے رہے ہیں اس لیے کبھی ان کے ہاں درد چیخ بن جاتا ہے اور کبھی اس درد سے پھول کھل اٹھتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امین صدیقی نے اپنی بات اپنے لہجے میں کہی ہے اور مانگے کے اجالے سے اپنے فکر کا چراغ روشن کرنے کی سعی نہیں کی۔ چند برس قبل مالی گاؤں میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب اس ملاقات کے نقوش مٹتے جا رہے تھے۔ "مامن" پڑھی تو یوں محسوس ہوا جیسے میں امین صدیقی سے دوبارہ مل رہا ہوں۔ ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ ان کا فیضِ مجلس اٹھا رہا ہوں، ان کی خود کلامی میں شامل ہوں۔

گردوپیش

ادیبوں اور دانشوروں کی قومی کانفرنس ۱۹۹۴ء

اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ادیبوں اور دانشوروں کی قومی کانفرنس ۱۹۹۴ء/۹ تا ۱۱/اکتوبر جاری رہی، ۹/اکتوبر دس بجے صبح اسلام آباد کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں صدرِ پاکستان جناب فاروق احمد لغاری نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز تلاوتِ کلام سے ہوا۔ نظامت کے فرائض جناب افتخار عارف ناظم اعلیٰ اکادمی ادبیات پاکستان نے انجام دیے۔

جناب فخر زماں چیرمین اکادمی ادبیات نے اپنے استقبالیہ کلمات میں ملک بھر سے اِس قومی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ادیبوں اور دانشوروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوشی و امتنان کا اظہار کیا۔

صدرِ پاکستان نے اپنے خطبے میں اور وزیر اعظم نے اپنے پیغامات میں ادیبوں اور دانشوروں کے اتنے بڑے اجتماع کو خوش آمدید کہا۔ اور یہ توقع ظاہر کی کہ پاکستان کے ادیب و دانشور جمہوری اقدار کے تحفظ اور فروغ کے لیے اپنا مثالی کردار ادا کرتے رہیں گے۔ وزیر اعظم کے پیغامات اُن کی معاون خصوصی برائے سماجی بہبود بیگم شہناز وزیر علی نے پڑھ کر سُنائے۔

وزیر اعظم نے ادیبوں اور دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ لوگ آگے آئیں اور ایک ایسے کلچر کے فروغ میں مدد کریں، جس میں لوگ دوسروں کے خیالات کو برداشت کرنے کا چلن اپنائیں اور مخالفین کی باتوں کو دھیرج سے سُننے کی عادت ڈالیں۔

صدرِ پاکستان جناب فاروق لغاری نے اپنے افتتاحی خطبے میں کہا کہ موجودہ حکومت اہلِ قلم کی حُرمت کی پاسدار ہے اور اس بات کی یقین دہانی کراتی ہے کہ ادیبوں اور دانشوروں کی فلاح و بہبود کا کوئی پروجیکٹ محض فنڈ کی کمی کی وجہ سے تشنۂ تکمیل نہیں رہے گا۔

جناب لغاری اور محترمہ بینظیر بھٹو نے ادیبوں اور دانشوروں کے اُس جرات مندانہ کردار کو بہت سراہا جو انہوں نے آمرانہ نظام میں حق کی سربلندی کے لیے روا رکھا۔ اور سختیاں جھیلنے کے باوجود حق کا پرچم بلند کیا اور مزاحمتی ادب رقم کرتے رہے۔ دونوں سربراہانِ مملکت نے اِس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا کہ حکومت اور اہلِ قلم حضرات، انسانی حقوق اور جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے ہاتھ ملا کر قدم بڑھائیں۔

صدر لغاری نے ایک بار پھر یقین دہانی کرائی کہ مختلف شہروں میں رائٹرز کالونیوں اور رائٹرز کلب کے قیام کے سلسلے میں اکادمی ادبیات کی جانب سے جو تجاویز پیش کی گئی ہیں اُن پر وفاقی اور صوبائی حکومتیں عمل درآمد کرانے کی ہر ممکن کوششیں کریں گی۔

اس موقع پر صدرِ پاکستان نے اکادمی ادبیات کو پاکستانی ادب کے فروغ اور اہلِ قلم کی بہبود کے لیے ایک کروڑ روپے کے عطیے

کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے ادیبوں اور دانشوروں میں اکادمی ادبی انعامات تقسیم کیے۔
آخر میں سیّد خورشید احمد شاہ وفاقی وزیر تعلیم نے اظہارِ تشکر کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد تین بجے لائبریری آڈیٹوریم اسلام آباد میں قومی ادبی مذاکرہ کی پہلی نشست کا آغاز ہوا۔ مجلس صدارت میں جناب ممتاز مفتی جناب عبد اللہ حسین جناب عبد اللہ جان جمالدینی، محترمہ ہاجرہ مسرور اور جناب قلندر مومند اور دوسرے تشریف فرما تھے۔ پہلی نشست کا موضوع "ادب اور جمہوریت" تھا اس موضوع پر جناب ظہیر کاشمیری، جناب شمشیر الحیدری، ڈاکٹر انور سجاد، ڈاکٹر انوار احمد اور جناب سلیم راز نے مقالے پڑھے۔ اس نشست کا اختتام صدر کے اظہار خیال پر ہوا اسی شب ایوانِ صدر میں ادیبوں اور دانشوروں کے اعزاز میں صدر کی جانب سے ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔

دوسری نشست ۱۰/اکتوبر ۹۴ء کو دس بجے صبح سے شروع ہوئی اور شام تک جاری رہی، مجلسِ صدارت کو پروفیسر کرار حسین، جناب ابراہیم جویو، جناب جمال ابڑو جناب قتیل شفائی، جناب یوسف شاہین، جناب احمد راہی، جناب احمد فراز اور جناب حمید اختر نے زینت بخشی۔

اِس نشست میں پڑھے جانے والے مقالات کا موضوع "پاکستانی ادب میں مزاحمتی رویے" تھا اس موضوع کے حوالے سے اردو شاعری پر محترمہ فہمیدہ ریاض، اُردو نثر پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، پنجابی ادب پر محترمہ افضل توصیف، سندھی ادب پر قاضی امر جلیل، پشتو ادب پر ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، بلوچی ادب پر، جناب عبد اللہ جان جمالدینی، کشمیری ادب پر جناب طاؤس بانہالی، سرائیکی ادب پر ڈاکٹر طاہر تونسوی، ہندکو ادب پر جناب مختار علی نیر، بلتی کھوار، شنا، بروسکی ادب پر سیّد محمد عباس کاظمی، گجراتی ادب پر کھتری عصمت علی پٹیل اور پاکستانی انگریزی ادب پر پروفیسر جیلانی کامران اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن طارق نے مقالے پڑھے۔
اس نشست کا خوش آئند پہلو یہ تھا کہ تمام علاقائی زبانوں کے ادب کا تعارف قومی زبان میں کرایا گیا اور چونکہ قومی زبان پاکستان کے ہر علاقے میں یکساں بولی اور سمجھی جاتی ہے، لہذا یہی زبان مختلف علاقائی زبانوں کے خیالات کو ایک دوسرے تک پہنچانے کے فرائض بہ احسن انجام دیتی رہی۔

صدارتی کلمات میں پروفیسر کرار حسین نے بہت برمحل برملا اور قرینے سے ہر بات کا جواب دیا۔ اُن کی گفتگو عالمانہ شان کی مظہر تھی انھوں نے کہا مزاحمت آگ سے پھول کھلانے کے مصداق ہے۔ مزاحمت کی حیثیت ادب کی روح کی سی ہے البتہ وقت وقت سے اِس کا لہجہ بدلتا رہتا ہے۔

اُنھوں نے کہا قدیمی دور میں جو کام تصوف سرانجام دیتا تھا ہمارے ہاں اُس کی صورت سیاست کی ہے۔
کلچر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پروفیسر کرار حسین نے کہا۔ کلچر کی اہمیت اتنی ہی ضروری ہے جتنی فوج کی، انھوں نے کہا بہت سے لوگ نظریہ کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن چند صاحبانِ نظر وہ ہوتے ہیں جو اِس نظریہ سے نظر پیدا کرتے ہیں۔

زبان کے حوالے سے اُنھوں نے کہا کہ زبان سے، زبان کی لڑائی سوائے سیاست کے اور کچھ نہیں! میں یہ بات عجیب دیکھتا ہوں کہ مختلف زبانوں کے نام لیوا ڈنڈے لے کر ایک دوسرے کی طرف دوڑ رہے ہیں اور زبانوں کا یہ حال ہے کہ آپس میں گلے مل رہی ہیں۔

دس اکتوبر ۹۴ء کی تیسری نشست تین بجے سے شروع ہوئی اس کا موضوع "ادب اور اکیسویں صدی" تھا۔ مجلسِ صدارت میں جناب انتظار حسین، جناب منیر نیازی، جناب افراسیاب خٹک، جناب افضل حسن رندھاوا، جناب جام ساقی، جناب نادر قمبرانی، محترمہ خیر النساء جعفری اور جناب رسول بخش پلیجو تشریف فرما تھے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی محترمہ فرخندہ لودھی، جناب رضی عابدی، جناب عزیز محمد بگٹی، جناب ہاشم بابر، جناب سحر انصاری اور محترمہ فہمیدہ حسین نے ادب اور اکیسویں صدی کے موضوع پر مقالات پڑھ کر سنائے۔ نشست کا اختتام صدارتی کلمات پر ہوا۔

منگل ۱۱/اکتوبر ۹۴ء کو حسب دستور چوتھی نشست کا آغاز دس بجے صبح کو ہوا۔ مجلس صدارت میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ شاہ جسٹس ریٹائرڈ خدا بخش مری، جناب ظفر اقبال محترمہ زیتون بانو ڈاکٹر آفتاب احمد خاں، محترمہ خالدہ حسین، جناب جانباز جتوئی اور جناب جاوید شاہین تشریف رکھتے تھے اِس نشست میں پڑھے جانے والے مقالات کا موضوع "پاکستانی ادب کے مسائل" تھا، اس موضوع پر بہادر خاں، محترمہ کشور ناہید، منو بھائی، جناب سوہمو گیان چندانی ڈاکٹر لئیق بابری، جناب مسعود مفتی اور جناب حمید اختر نے مقالات پڑھے۔

اختتامی اجلاس ۳ بجے سہ پہر کو شروع ہوا۔ اِس میں قراردادیں پیش کی گئیں، فہمیدہ ریاض نے قراردادوں کی قرات کی، قرار داد کمیٹی کے ارکان میں خواجہ مسعود، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، جناب سراج الحق میمن، احمد بشیر مظہر جمیل، مسلم شمیم، حسن عابدی، ایوب بلوچ، سلیم راز، الطاف قریشی اور فرخندہ لودھی شامل تھیں۔ جناب فخر زمان، چیرمین اکادمی ادبیات پاکستان نے اپنے اختتامی کلمات میں دوسرے تنظیمی امور پر گفتگو کرنے کے علاوہ ادیب برادری کو یقین دلایا کہ اُن کے اِس ادارے میں شمولیت کا ایک مقصد یہ ہے کہ وہ ادیبوں اور دانشوروں کی بہتری و بہبود کے لیے پروگرام مرتب کر کے سربراہان مملکت کو پیش کریں۔ اور اس پر عمل درآمد کرائیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ صدر و وزیر اعظم ادیبوں اور دانشوروں کے مسائل و معاملات سے بہ طور خاص ہمدردی رکھتے ہیں انھوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ وفاقی اور صوبائی سطح پر یہ ہدایت بھی کی جائے گی کہ ادیبوں اور دانشوروں کی بہتری و بہبود کے پراجکٹ محض فنڈز کی کمی کے نام پر تشنہ تکمیل نہ رہ جائیں۔ اس کے باوجود اگر اِن پر عمل درآمد نہ ہوا اور اِس میں لیت و لعل برتا گیا تو ہمارے اِس ادارے سے چمٹے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔

زبان کے حوالے سے بعض ایسی تجاویز بھی سامنے آئیں جو قائدِ اعظم کے ارشادات کی روشنی میں ۱۹۷۳ء کے آئین میں طے پا چکی ہیں۔ ادیبوں اور دانشوروں کی اِس قومی کانفرنس ۹۴ء میں ایک اندازے کے مطابق ساڑھے سات سو سے زیادہ اہلِ قلم بہ حیثیت مندوب شریک ہوئے تھے۔ اِس کانفرنس کی تمام تر کارروائیاں بڑے آزاد ماحول میں ہوئیں، ہر مندوب کو تجویز پیش کرنے اور اپنے جذبات کے اظہار کی آزادی تھی۔ پاکستان میں بولی جانے والی چھوٹی چھوٹی زبانوں کے اہلِ قلم کو بھی مدعو کیا گیا تھا، اور اُنھیں اُس زبان کے ادب کے بارے میں مقالے پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ایک طرف سندھی و پنجابی و پشتو و بلوچی جیسی بڑی علاقائی زبانیں تھیں، تو دوسری طرف، سرائیکی، براہوی گجراتی اور بلتی زبانوں کے ادیب نے بھی مقالے پڑھے۔

اتنے بڑے اجتماع کے قیام و رہائش اور دیگر سہولتیں پہنچانے کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان کے ناظم اعلیٰ جناب افتخار عارف اُن کے رفقائے کار اور اُن کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے اکادمی کے اہل کاروں کی مستعدی اور خاطر داری قابلِ ستائش ہے۔

روم یونیورسٹی کے ڈاکٹر رحیم رضا کی انجمن میں آمد

۳/اکتوبر ۹۴ء کو انجمن میں ڈاکٹر رحیم رضا تشریف لائے، وہ اورینٹل یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ روم میں اُردو اور فارسی کے شعبۂ تدریس سے متعلق ہیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مہمان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر رحیم رضا کا تعلق بہار سے ہے، لیکن اُن کا قیام زیادہ تر کلکتہ میں رہا، وہیں ان کی ثانوی درجہ کی تعلیم شروع ہوئی پھر تاریخ اور فارسی میں اعلیٰ سند حاصل کی یعنی ایم اے کیا فارسی کی وجہ سے وہ ایران چلے گئے۔ "اور احوال و آثار و تصحیحِ کلیات محمد قلی سلیم تہرانی، کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے مزید کہا کہ ڈاکٹر رحیم رضا، اُردو فارسی اطالوی اور انگریزی میں یکساں مہارت رکھتے ہیں، وہ اطالوی نیشنل ہیں لیکن تعلق خاطر پاکستان سے ہے۔ اِسی لیے فارسی کے علاوہ روم میں اُردو بھی پڑھاتے ہیں۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی کے اِس سوال کے جواب میں کہ اطالوی ہم سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں بہ نسبت دوسرے یوروپین ممالک کے۔ ڈاکٹر رحیم رضا نے کہا آپ کا یہ احساس درست ہے۔ تاریخی اعتبار سے عرب اور اطالوی بہت عنوان سے ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں عربی زبان کے اثرات اطالوی زبان پر گہرے ہیں۔ مثال کے طور پر دہشت گرد یا CRIMINAL کو اطالوی "مافیا" کہتے ہیں اِس لفظ کی موجودہ شکل میں اختراع اطالوی ہے۔ یہ "مافیا" ساری دُنیا میں ایک ایسے مسئلہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس سے مفر نہیں۔ اب یہ ساری دُنیا میں متوازی حکومت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

ڈاکٹر رحیم رضا نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ لفظ "مافیا" عربی کے لفظ "مخفیہ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ عربی میں "مخفیہ" بھی ایسے ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اُنھوں نے ایک اور مثال دیتے ہوئے کہا کہ سجی بنی لڑکی یا اچھی لڑکی کے لیے اطالوی میں کوئی لفظ نہیں، یہ لوگ لڑکی کو "رِگاتا" کہتے ہیں، یہ "رِگاتا" عربی رقاصہ کی بگڑی شکل ہے۔

ڈاکٹر رحیم رضا نے برطانیہ میں اُردو کے حوالے سے بتایا کہ لندن کے سارے اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ انگلینڈ میں اُردو کو خارجی زبان تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے رالف رسل کی اردو ترویج مساعی و درسی خدمات کو بہت سراہا اور سب سے افضل جانا۔ اُنھوں نے کہا اس بارے میں رالف رسل کا رویہ "مشنری" ZEAL رکھتا ہے۔

اُنھوں نے کہا کہ اطالوی مستشرق ڈاکٹر بوسانی کی اردو خدمات وقیع ہیں دراصل ڈاکٹر بوسانی کے بلاوے پر ہی میں اطالیہ گیا، اور ابتدا میں ان کی معاونت پر مامور ہوا۔

گفتگو کا یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ گفتگو میں وقفے وقفے سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر عتیق، ڈاکٹر فہیم اعظمی اور جناب ذوالفقار مصطفےٰ حصّہ لیتے رہے ان حضرات کے علاوہ اس نشست میں جناب امراؤ طارق (نائب معتمد انجمن) جناب شہزاد منظر اور جناب شہاب قدوائی موجود تھے۔

اسکاٹ لینڈ میں اُردو کا آغاز

اسکاٹ لینڈ کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس کے اسکولوں میں مستقل طور سے اُردو کی تدریس اور امتحانات کا انتظام ملکی تعلیمی نظام کے تحت عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ ان پاکستانیوں کی سالہا سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو اپنے بچوں کو اُردو میں بولتے اور لکھتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسکاٹ لینڈ کے وزیر تعلیم لارڈ جیمس ڈگلس ہیملٹن نے اُردو کا معیاری امتحان متعارف کرتے ہوئے بتایا کہ اس نوعیت کے امتحان کا مطالبہ حالیہ برسوں میں شدید ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں طلبہ جلد ہی اُردو سے بہرہ ور ہو کر اسکولوں سے اسکاٹش منظور شدہ قابلیتی اسناد حاصل کر سکیں گے۔

اسکاٹش امتحانی بورڈ امتحانی پرچوں اور نصاب کی جانچ پڑتال بھی کرے گا۔

فی الحال جن اسکولوں میں اُردو رائج ہے وہ انگلینڈ کے GCSE نصاب کی پیروی کرتے ہیں جو طلبہ اسکاٹ لینڈ میں شریک ہوتے ہیں ان کی صلاحیتوں کی اسکاٹش سسٹم کے مطابق کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

آیندہ ہائیر سکینڈری کے طلبہ جو اُردو پڑھنا پسند کریں گے ان کو یوروپین زبان کا ایک اضافی کورس بھی پڑھنا پڑے گا

اور اسی طرح ان کو اپنے کلچر کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اپنے کلچر اور ایک بیرونی زبان سے منسلک ہونے کا بیک وقت موقع فراہم ہوگا جس سے مستقبل میں اپنے کیریر کو سنوارنے میں مدد ملے گی۔

بلاباسٹن اکیڈمی جو اسکاٹ لینڈ کا سیکنڈری اسکول ہے، جہاں ایشیائی باشندے بہ کثرت ہیں اس کے سربراہ ڈاکٹر جم کیسل نے اُردو تدریس کی ترقی کو خوش آمدید کہا ہے اور اُمید کی ہے کہ اُردو کی جو نصابی کتابیں تیار کی جائیں گی وہ اسکاٹس طلبہ کی خصوصی ضرورت کے مطابق ہوں گی۔ فی الحال جن طلبہ نے اُردو کا نصاب لے رکھا ہے وہ اپنے گھروں پر ان کتابوں کے ذریعے پڑھتے ہیں جو پاکستان میں تیار ہوئیں کیونکہ فی الحال اسکولوں میں دائرہ تدریس بہت ہی محدود ہے۔

امریکی ایڈورڈ ایلبی کا تازہ ترین ڈرامہ "تین لمبی عورتیں"

امریکی ڈرامہ نویس ایڈورڈ ایلبی (EDARD ALBEE) جنہوں نے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشروں میں براڈوے (BROADWAY) میں بڑی شاندار کامیابیاں حاصل کیں اب بھی ڈرامے کی شکل وصورت اور نفس مضمون کے سلسلے میں کامیاب تجربے کر رہے ہیں۔ ان کے تازہ ترین ڈرامہ "تین لمبی عورتیں" (THREE TALL WOMEN) کو پلیٹزر (PULTIZER) پرائز ملا ہے۔ یہ ڈرامہ مشرق قریب، افریقہ اور جنوبی ایشیا کے ناظرین کے لیے پورٹ لینڈ آریگان کے آرٹس ریپیٹری تھیٹر (ARTIST'S REPERTORY THEATER) کی طرف سے کھیلا جارہا ہے۔

واشنگٹن ڈی سی کے ایرینا اسٹیج کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر لارنس میسلن (LAWRENCE MESLON) نے ۲۲ اگست کو ایک ورلڈ ٹیلی ویژن گفتگو میں تین لمبی عورتیں اور ایلبی کے دوسرے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اس گفتگو کے دوسرے شرکاء نے کولمبو، دمشق اور لاہور سے حصّہ لیا۔ میسلن ایلبی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں اور کئی سال پہلے واشنگٹن میں سمتھ سونین ایسوسی ایٹ کے پروگرام کے لیے ڈرامہ نگار کے انٹرویو بھی کر چکے ہیں۔

"تھری ٹال ویمن" دو ایکٹ کا ڈرامہ ہے جس کا سیٹ ایک ۹۱ سالہ دولت مند عورت کے کمرے میں لگایا گیا ہے۔ اس کی دیکھ بھال پر اک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک نوجوان عورت جس کی عمر اٹھائیس انتیس برس ہوگی مامور ہیں۔ دوسرے ایکٹ میں یہ راز فاش ہوتا ہے کہ تینوں عورتیں اصل میں ایک ہی فرد ہیں۔ جو آپس میں ایک عورت کی زندگی کے نشیب و فراز پر بحث کرتی ہیں۔ ہر عورت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا دور، خواہ وہ مفہوم جوانی کی صورت میں تھا یا ادھیڑ عمر کی دانش مندی کی صورت میں یا زیادہ عمر کے سکون کی صورت میں..... مسرور لمحات پر مشتمل تھا۔

میسلن کے خیال میں ڈرامے میں جن موضوعات کو فروغ دیا گیا ہے انہوں نے کہا کہ "اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم نے جو زندگی گزاری ہے اس کو سمجھ لیں۔ اس سے سمجھوتہ کر لیں اور اس پر خواہ مخواہ بہت زیادہ افسوس نہ کرتے رہیں۔ معمر ترین عورت آخر میں ایک مکمل زندگی سے بغلگیر ہوجاتی ہے جو اس نے اچھی طرح گزاری ہے اور اس سے بہتر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔"

"تھری ٹال ویمن" کے اور بھی معانی و مطالب نکالے جاسکتے ہیں اور یہ ایک اچھی روایت شکن تحریر کی علامت ہے۔ میسلن نے ایلبی کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے الفاظ دوہرا دیئے "ڈرامے تیز دھار ہونے چاہئیں۔ وہ لوگوں کے اندر داخل ہوجانے چاہئیں جس سے کوئی فرق بھی پڑے وہ اس قابل ہونے چاہئیں کہ آپ ان پر دھیان دینے پر مجبور ہوجائیں۔ اب بہت سے ڈراموں کے سرے گول ہیں۔"

آرٹسٹس ریپرٹری تھیٹر کمپنی نے "تھری ٹال ویمن" کی نمائش کے لیے سری لنکا کا دورہ ۲۶ اگست سے شروع کر دیا ہے۔ یہ ڈرامہ بھارت، بنگلہ دیش، پاکستان کینیا، مصر اور اردن میں بھی دکھایا جائے گا اور امریکی انفرمیشن ایجنسی کے زیرِ اہتمام اس کی

نمائش کا اختتام اکتوبر کے آخر میں شام میں ہوگا۔ ایڈروڈ ایلبی ۱۹۲۸ء میں ورجینا میں پیدا ہوئے میسلن کا کہنا ہے کہ ایلبی کے لیے غیر یقینی صورت حال اس وقت شروع ہوئی جب لے پالک کی حیثیت سے اس کی ماں نے زندگی کے بارے میں اس کی سوچ کو ناپسند کرتے ہوئے اسے گھر سے نکال دیا اور وصیت سے محروم کر دیا۔ بعد میں نوجوان ایڈورڈ کو کیتھے ایلبی تھیٹر سرکٹ کے جزوی مالک ریڈ۔ اے ایبلی نے متبنی بنالیا۔

انھوں نے ۶۴ - ۱۹۶۳ء میں بہت سے ایوارڈ حاصل کیے جن میں اینٹائے نیٹے پیری (ٹونی) ایوارڈ، دی نیویارک ڈرامہ کرٹکس ایوارڈ، اور فارن پریس ایسوسی ایشن ایوارڈ بھی شامل تھے۔ فارن پریس ایسوسی ایشن کا ایوارڈ انھیں "ورجینا وولف سے کون خوفزدہ ہے؟" (WHO IS AFRAID OF VIRGINA WOLF) کے لیے دیا گیا۔ یہ کھیل اتنا مقبول ہوا کہ ہالی ووڈ نے فوراً ہی اس کی فلم بنادی جس میں ایلزبتھ ٹیلر اور رچرڈ برٹن نے بھی کام کیا۔ ۱۹۷۶ء میں ایلبی نے ایک ڈرامہ "ڈیلیکٹ بیلنس" کے لیے دوسری مرتبہ پلیٹزر پرائز حاصل کیا۔

(نظر و خبر اسلام آباد)

مشتاق احمد یوسفی کے اعزاز میں ایک شام

پچھلے دنوں آرٹس کونسل آف پاکستان کی ادبی کمیٹی کی طرف سے ملک کے نامور ادیب ممتاز طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے اعزاز میں ایک شام ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں شہرِ قائد کے شعرا و ادبا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

حسبِ معمول تقریبِ ملاقات تاخیر سے شروع ہوئی۔ ابراہیم نفیس نے کہ ناظمِ تقریب تھے۔ یوسفی صاحب کو ڈائس پر جلوہ افروز ہونے کی دعوت دی اُن کے بعد محترمہ قدسیہ اکبر، ہمایوں اختر، رضوان احمد اور انجم خاں اسٹیج پر بلائے گئے۔ تلاوتِ کلامِ پاک کی سعادت مظہر الحق نے حاصل کی۔

کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے ہمایوں اختر نے "ممدوحِ شام" کا مختصر تعارف کرایا اور کہا، یوسفی صاحب کا ادب میں جو اعلیٰ مقام ہے اُس سے ہم سب واقف ہیں۔ یوسفی صاحب کے ساتھ مل بیٹھنے کی تمنا ایک عرصے سے دل میں تھی جو آج پوری ہو رہی ہے۔ آج کی شام میں اُن کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

اس کے بعد سکریٹری آرٹس کونسل قدسیہ اکبر نے خطاب کرتے ہوئے کہا مشتاق یوسفی سے صاحب بات کرتے ہوئے ہم ڈرتے تھے سب سے بڑی مشکل یہ درپیش تھی کہ انھیں "شامِ ملاقات" کے لیے کیسے آمادہ کیا جائے۔ گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ چنانچہ بڑی ہمت اور حوصلے کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا۔ اُن کے راضی ہوجانے کے بعد ایک بے پایاں خوشی کا احساس ہوا۔ ویسے تو اس بات کا ہم سب کو علم ہے کہ اُن کی تحریریں ایسی ہیں جیسے تپتے ہوئے صحرا میں کوئی نخلستاں نظر آجائے اور انسان تھوڑی دیر کے لیے سستا لے۔

معروف افسانہ نگار رضوان احمد نے مشتاق یوسفی صاحب کی شخصیت پر ایک عمدہ تعارفی مضمون پڑھا، اور کہا وہ ادب کی ایک نہایت معتبر اور اہم شخصیت ہیں۔ انھیں ستارۂ امتیاز بھی مل چکا ہے اس ہلکے پھلکے طنز و مزاح سے بھرپور مضمون کے بعد سحر مظہر علی نے یوسفی صاحب کی خدمت میں پھولوں کا گلدستہ (بوکے) پیش کیا اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یاور مہدی نے ادبی کمیٹی کی جانب سے "شیلڈ" پیش کیا۔

اب باری تھی مہمانِ خصوصی اور آج کی شام کے ممدوح محترم مشتاق احمد یوسفی کی، جنھوں نے ادبی کمیٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "جو توصیفی کلمات میرے لیے استعمال کیے گئے ہیں وہ محض حسنِ ظن پر مبنی ہیں اور اظہارِ تشکر کے سوا کچھ نہیں۔ اپنی

تعریف میں، میں جو کچھ کہتا ہوں خود کہتا ہوں کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ میں نے تقریباً دنیا کے بیشتر ممالک کی سیر کی ہے مگر وطن آکر جھوٹ نہیں بولے یعنی سفر نامہ نہیں لکھا۔ اس کے بعد انھوں نے نہایت عمدہ مضمون جو قدسیہ اکبر سے آرٹس کونسل میں ملاقات سے متعلق تھا پڑھ کر سنایا جسے سن کر مجمع زعفران زار بن گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے کئی دلچسپ مضامین کے اقتباسات اپنے مخصوص لہجے اور آواز میں پڑھ کر سنائے۔ لوگوں نے اتنی محویت اور دلچسپی سے اُنھیں سنا کہ وقت کی طنابیں کھنچ گئیں ــــ، ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آگئے اور شام جو اب رات میں بدل گئی تھی خوشگوار معلوم ہونے لگی تھی۔ آخر میں قدسیہ اکبر نے ان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔

(رپورٹ: احمد زین الدین)

"ذکرِ ارفع" اور "بوجھیں تو جانیں" کی تقریبِ تعارف

گزشتہ دنوں جناب مبارک مونگیری مرحوم کی چھٹی برسی کے موقع پر اُن کے دو شعری مجموعوں کی تقریب تعارف، مبارک مونگیری میموریل اکیڈمی اور بابائے اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سماعت گاہ نیپا میں منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر کرار حسین نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی پروفیسر ڈاکٹر عبدالوہاب وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی تھے مگر وہ بوجوہ تشریف نہ لاسکے۔ مجلس استقبالیہ کے چیرمین محترم حمید نور اور محمد سلیمان ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ اور نظامت کے فرائض جناب علی حیدر ملک نے انجام دیے۔ تلاوتِ کلامِ پاک کی سعادت قاری حبیب اللہ نے حاصل کی۔ آنسہ نادیہ بیگ نے خوش الحانی سے حضرت مبارک مونگیری کی نعت پیش کی اس کے بعد اُن کی دو مختلف نعتیں وقفے وقفے سے رضی عظیم آبادی اور حمید احمد شاہد نے پڑھیں۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے جناب فاروق جوبش نے کہا "ذکرِ ارفع" لوحِ دل پر حدیثِ عشق کا نقشِ اوّل ہے اس کتاب میں حضرت مبارک مونگیری نے جس طرح واردات و کیفیات قلبی کو نظم کیا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ امیر الاسلام ہاشمی نے "بوجھیں تو جانیں" کے حوالے سے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جناب ذاکر علی خاں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ اپنے بزرگوں کی یاد کو تازہ رکھنا ایک جہاد سے کم نہیں جو ان کے صاحبزادے اقبال مجیدی نے کیا ہے۔ مبارک صاحب کی دونوں کتابوں میں باطنی خواص زیادہ ہیں ظاہری اتنے نہ سہی۔ ان میں شاعر کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ "بوجھیں تو جانیں" میں چند شعرا کے بارے میں کچھ باتیں ناگفتنی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔"

جناب اقبال مجیدی نے اپنے والد مرحوم کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا اور جناب راغب مراد آبادی نے موقع کی مناسبت سے چند فی البدیہہ رباعیاں پیش کیں۔

اس کے بعد محترمہ رعنا اقبال نے پروفیسر کرار حسین کو بابائے اُردو فاؤنڈیشن کی طرف سے گون پہنایا اور اقبال مجیدی نے "بوجھیں تو جانیں" کا ایک نسخہ پیش کیا۔

صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر کرار حسین نے کہا اس محفل میں شرکت کر کے مجھے روحانی مُسرت ہو رہی ہے ایسا لگتا ہے جیسے یہ خوشی میرا انتظار کر رہی تھی۔ انھوں نے مبارک صاحب سے نہ ملنے پر اظہار افسوس کیا اور کہا اے کاش ہم مل لیے ہوتے۔ وہ ہمارے ہمعصر تھے ایسے ہی لوگوں سے زندگی کا اعتبار قائم ہوتا ہے آج ہم سب ایک نعت کی کتاب کی رونمائی کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ مبارک صاحب کی نعت پڑھ کر مجھے بڑا سہارا مل رہا تھا۔ حضور صلعم کی ذات محبت و عشق کا محور ہے۔ دیکھو تو اسی ذات نے ہم سب کو یکجا کر رکھا ہے۔ انھوں نے کہا ان کی دوسری کتاب "بوجھیں تو جانیں" کو پڑھ کر ایک اور زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی

ہے یعنی وہ زمانہ جس میں ہجو کہی جاتی تھی۔ شعر کے اندر خاکہ لکھا جانا ایک بہت بڑا خیال اور آئیڈیا ہے۔

جناب حمید نور نے اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا

(رپورٹ: احمد زین الدین)

"تاب سخن" کی رونمائی

۱۷/اکتوبر ۹۴ء کو فکشن گروپ اور آرٹس کاؤنسل آف پاکستان کی جانب سے جناب محمد رضا کاظمی کی تنقیدی کتاب "تابِ سخن" کی تقریب رونمائی آرٹ کونسل میں منعقد ہوئی، صدارت پروفیسر ڈاکٹر کلیم الرحمٰن نے فرمائی، نظامت کے فرائض جناب علی حیدر ملک نے انجام دیے۔

تقریب کا آغاز مولانا فخر الدین کی تلاوتِ آیات ربانی سے ہوا۔ جناب علی حیدر ملک نے صاحبِ کتاب محمد رضا کاظمی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جلد ہی اُردو تنقید نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ بعض بڑے نقادوں مثلاً آل احمد سرور اور شمس الرحمٰن فاروقی کی آرا سے یہی کچھ ظاہر ہوتا ہے۔

محترمہ شاہدہ حسن نے اپنے مقالے میں کہا کہ "تاب سخن" تنقید کی تنقید پر مشتمل ایک کتاب ہے۔ اس میں محمد رضا کاظمی ایک باخبر باشعور اور ذمے دار ناقد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ تاب سخن کے پڑھنے والے ہم خیال ہونے کی بجائے اس کے ہم نوا ہونے لگتے ہیں یہ کتاب نہ صرف تنقیدی بصیرت رکھنے والوں کو محظوظ کرے گی بلکہ اس سے اردو ادب میں صحت مند مکالمے کو فروغ حاصل ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے مختصر مضمون میں کہا کہ تنقیدی کتابوں پر تنقید لکھنا نسبتاً مشکل کام ہے۔ محمد رضا کاظمی صاحب کا یہ احسان کم نہیں ہے کہ انھوں نے تنقید کو مدح سرائی سے رُستگاری دلانے کی سعی کی ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی نے کہا کہ رضا کاظمی بڑی محنت اور دیانتداری سے لکھ رہے ہیں۔ ادب میں طرف داری کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ سخن فہمی کم ہوگئی ہے آج کل نقاد کا حال نیلام میں بولی لگانے والوں جیسا ہوگیا ہے جو اپنے مال کو کبھی خراب نہیں کہتا۔

تقریب کے صدر ڈاکٹر کلیم الرحمٰن نے کہا..... تاب سخن میں شامل دو مضامین ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور کلیم الدین احمد سے متعلق بہت اچھے ہیں انھوں نے کہا جس طرح ادب یونیورسل ہوتا ہے اُسی طرح تنقید بھی یونیورسل ہوتی ہے۔ تنقید کا مقام صرف ادب میں ہی نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق سارے معاشرے پر ہوتا ہے۔ تنقیدی ذہن کی معاشرے کو بہت ضرورت ہے انھوں نے تنقید کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اچھی تنقید اچھے تخلیقی ادب کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ انسان کو وہی کام کرنا چاہیے جو وہ اچھے انداز میں کرسکتا ہے۔ محمد رضا کاظمی کا مزاج تنقیدی ادب سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔

تقریب کا اختتام عصرانے پر ہوا۔

قومی زبان کا مطالعہ ہر گھر کی ضرورت ہے

نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

خود نوشت

اسلم فرخی، ڈاکٹر	تلاشِ وفا	صریر، کراچی سالنامہ جولائی ۹۳ء ص ۱۱۱
افتخار احمد عدنی	یادوں کا سفر، بابا ذہین شاہ تاجی	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۳ء ص ۴۳
افتخار احمد عدنی	ہم سفر قسط (۱)	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۲۹
بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری	ہم سفر قسط (۲)	افکار، کراچی اگست ۹۳ء ص ۲۲
بیگم حمیدے اختر حسین رائے پوری	ہم سفر قسط (۴)	افکار، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۲۳
بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری	ہم سفر قسط (۵)	افکار، کراچی نومبر ۹۳ء ص ۲۴
تابش دہلوی	جگر مراد آبادی، کچھ یادیں	افکار، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۲۲
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر	سرمایۂ حیات	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۷
حسرت کاسگنجوی	گزشتہ یادیں	محفل، لاہور جولائی ۹۳ء ص ۳۳
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر	ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا	محفل، لاہور جولائی ۹۳ء ص ۵۵
ریحانہ سلطانہ، ڈاکٹر	مسعود حسین خاں کی وردِ مسعود قسط (۱)	نیرنگ خیال، راولپنڈی ستمبر ۹۳ء ص ۴۴
سید احتشام حسین	خود نوشت سوانح	ہماری زبان، دہلی یکم نومبر ۹۳ء ص ۲
سید ضمیر جعفری	ایک بات جسم سے ماورا	ارتقاء کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۲۵۳
شان الحق حقی، ڈاکٹر	نشید حریت، قدر مشترک سیمیا قسط (۱۹)	تخلیق، لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۸۹
شان الحق حقی، ڈاکٹر	مسز جبین حق کے ہند انگریزی ناول قسط (۲۰)	افکار، کراچی ۹۳ء ص ۵
شان الحق حقی، ڈاکٹر	بغلی گھوڑا، سر پر آرے، منہ پر اُف قسط (۲۱)	افکار، کراچی اگست ۹۳ء ص ۱۵
شان الحق حقی، ڈاکٹر	آمدِ سر آمدِ سخن، غزل (۱) قسط (۲۳)	افکار، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۱۵
شان الحق حقی، ڈاکٹر	سازِ خوش نوائے غزل (۲) قسط (۲۴)	افکار، کراچی نومبر ۹۳ء ص ۱۵
شاہ ابوالحسن قیصر	بزمِ شاد کی ایک یادگار ادبی محفل	افکار، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۱۷
		سب رس، کراچی جولائی ۹۳ء ص ۲۷

غلام ثقلین نقوی	والد محترم ------ ۲	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۳ء ص ۱۶۱
غلام مصطفٰے خاں، ڈاکٹر	میر اعلی گڑھ ایام طالب علمی	العلم، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۱۹
محمد رفیع الدین	جامعہ عثمانیہ چند یادیں	سب رس، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۱۷
محمود احمد برکاتی، حکیم	رام پور کی کچھ ان کہی کہانیاں	سب رس، کراچی اکتوبر ۹۳ء ص ۱۹
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر	سید فیضی، ایک شخص کئی روپ	ماہِ نو، لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۱۸
مسعود مفتی	ہمارے رویے اور قومی خودکشی قسط (۱)	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۳ء ص ۱۷
مسعود مفتی	ہمارے رویے اور قومی خودکشی قسط (۲)	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۳ء ص ۱۶
مسعود مفتی	ہمارے رویے اور قومی خودکشی قسط (۳)	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۲۴
مسعود مفتی	ہمارے رویے اور قومی خودکشی قسط (۴)	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۳ء ص ۲۸
مصطفی کریم	نقوشِ روم	ادب لطیف، لاہور اگست ستمبر ۹۳ء ص ۱۰
وفا راشدی، ڈاکٹر	داستان وفا قسط (۶) مامتا سے محرومی کے بعد محرومیاں	العلم، کراچی جولائی ستمبر ۹۳ء ص ۸۸
وفا راشدی، ڈاکٹر	داستانِ وفا شادی پھر اس کے بعد قسط (۷)	العلم، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۶۳
ہادی حسن رضوی	مسعود کھدر پوش ایک دیانت دار افسر	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۳ء ص ۳۴

سفر نامہ

اکبر رحمانی	صوبہ یوپی بھارت کا تعلیمی سفر نامہ	العلم، کراچی جولائی ستمبر ۹۳ء ص ۴۹
پرویز عاطف	کھلاڑی گھاٹ، ہالینڈ (۳)	تخلیق، لاہور اگست ۹۳ء ص ۸۹
پرویز عاطف	رخت ہالینڈ (۴)	تخلیق، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۸۵
پرویز عاطف	این فرنیک	تخلیق، لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۹۴
پورنیما چاؤلہ / امر چرن چاؤلہ	(ہندی سے ترجمہ) اُجالے اپنی یادوں کے	انشاء، کلکتہ اگست ۹۳ء ص ۲۳
ثاقب رزمی	سفر نامہ نگار سید احتشام حسین	ارتقا، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۲۲۵
رام لعل	جاں نواز کوچے نمبر (۳)	تخلیق، لاہور اگست ۹۳ء ص ۷۷
رام لعل	جاں نواز کوچے نمبر (۴)	تخلیق، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۷۹
زبیر احمد	سفر	صریر، کراچی سالنامہ جولائی ۹۳ء ص ۱۲۰
سعید ظفر	دادِ ابتلا، بلوچستان	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۳ء ص ۲۷
سلیم اختر، ڈاکٹر	سیاہ گھوڑا، سفر نامہ امریکہ	فنون، لاہور مئی جولائی ۹۳ء ص ۲۹۹
سلیم اختر، ڈاکٹر	نیویارک کا جمعہ بازار	دریافت، کراچی جولائی ۹۳ء ص ۴۵
سلیم اختر، ڈاکٹر	جہانِ مرغ و ماہی	صریر، کراچی اگست ۹۳ء ص ۲۴
سلیم اختر، ڈاکٹر	مشعل بردار	تخلیق، لاہور اگست ۹۳ء ص ۸۳
سید ضمیر جعفری	بحرِ اوقیانوس کے اُس پار	نیرنگ خیال، راولپنڈی ستمبر ۹۳ء ص ۳۱
شاہ محمد سراج الیقین	سفر حجاز	خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۵-۷۷/۹۲ء ص ۴۱۱
شوکت واسطی	چند دن عمان میں	تحریریں لاہور جولائی اگست ۹۳ء ص ۵۷
شوکت واسطی	چند دن عمان میں	تحریریں، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۱۹

ظہیر قریشی	سبز پوش وادیوں میں	محفل، لاہور نومبر ۹۳ء ص ۱۱۴
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	پندرہ دن چین میں	نگار، کراچی نومبر ۹۳ء ص ۵۴
محمد توفیق	لندن ڈائری	نیرنگ خیال، راولپنڈی جولائی ۹۳ء ص ۴۴
محمد عارف، ڈاکٹر	جانبِ بطحا قسط اوّل	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۳ء ص ۱۵
محمد عارف، ڈاکٹر	جانبِ بطحا قسط دوم	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۳ء ص ۲۰
محمد عارف، ڈاکٹر	جانبِ بطحا قسط سوم	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۳ء ص ۲۷
محمد عارف، ڈاکٹر	صہبائے بیروت	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۱۶
محمد کبیر خاں	اِک مومی مورت من موہنی سی	تخلیق، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۹۲
مسعود مفتی	ہمارے رویے اور قوی خودکشی (آخری قسط)	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۱۹

خطوط

سارا شگفتہ	بنام راجندر سنگھ بیدی، کشور ناہید	تشکیل، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۵۳
سید عبداللہ، ڈاکٹر	بنام اعجاز صدیقی	شاعر، بمبئی دسمبر ۹۳ء ص ۴
غلام جیلانی اصغر پروفیسر	خطوط بنام جمیل یوسف	تحریریں، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۳۲
قاضی عبدالودود	کچھ رقعے کچھ یادداشتیں	خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۵-۷۷/۹۲ء ص ۲۵۹

ملاقات

الطاف حسین شیروانی	افسوس کیسے کیسے سخن ہائے گفتنی۔۔۔۔	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۳ء ص ۴۵
انعام الحق جاوید، ڈاکٹر	ڈاکٹر صفات احمد علوی سے انٹرویو	اخبار اردو، اسلام آباد اکتوبر ۹۳ء ص ۹
ایم اے مشتاق	مالک رام سے ایک ملاقات	ہماری زبان، دہلی ۲۲/اگست ۹۳ء ص ۸
ایم ڈی شاد	ڈاکٹر انور سدید کے جوابات	محفل، لاہور جولائی ۹۳ء ص ۲۹
رفعت سعید	سراب میزائیل کے خالق چوہدری۔۔۔۔	سائنس، میگزین کراچی جولائی ۹۳ء ص ۱۵۶
طاہر لاہوری	طفیل ہوشیارپوری سے ملاقاتیں	محفل لاہور ستمبر ۹۳ء ص ۲۱
طاہر لاہوری	حافظ امرتسری سے ملاقاتیں	محفل، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۳۵
طاہر لاہوری	مشیر کاظمی سے ملاقاتیں	محفل، لاہور نومبر ۹۳ء ص ۸۵
ترجمہ قاضی قیصر الاسلام	مونیک شینائیڈر (ماہر تحلیل نفسی)۔۔۔۔	اردو، کراچی اپریل جون ۹۲ء ص ۱۱۱
آزاد ترجمہ قاضی قیصر الاسلام	فلسفی ادیب مشیلے لادیوف سے ایک گفتگو	فنون، لاہور مئی جولائی ۹۳ء ص ۱۱۱
کبیر احمد جائسی پروفیسر	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سنگین۔۔۔۔۔	تہذیب الاخلاق علی گڑھ جولائی ۹۳ء ص ۹
کیرن کلنتار اترجمہ سہیل احمد صدیقی	آرمینی شاعر پاروئیر سیواک سے گفتگو	قومی زبان، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۷۱
ماجد صدیقی	شریف کنجاہی سے ایک ملاقات	ادبیات، اسلام آباد ۲۵-۹۳/۶ء ص ۲۳۱
میاں محمد واجد	ڈاکٹر محمد اسلم ادیب چیرمین ایجوکیشن۔۔۔۔	سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۳ء ص ۱۴۹
ناصر زیدی	جناب قتیل شفائی سے مکالمہ	ماہ نو لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۴۶
ولین گنبرگ اترجمہ چوہدری ابن النصیر ایذرا پاؤنڈ سے۔۔۔۔		تشکیل، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۲۱۵

سیاست، صحافت، اور مملکت

ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا	عام مسلم آبادی اور زمام کار کی تبدیلی	ترجمان القران، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۲۵
ارشد اسلم	ابلاغ عامہ کے مضر اثرات	تہذیب اخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۳ء ص ۲۶
الیاس انصاری	یونان اور اسپانوی تارکین وطن کا------	ترجمان القرآن، لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۴۰
خالدہ جمیل	معاشرے میں خواتین کا کردار	تہذیب اخلاق، لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۴۵
خرم مراد	پاکستان اور امورِ مملکت	ترجمان القرآن، لاہور نومبر ۹۳ء ص ۳
شعائر اللہ خاں رامپوری	اردو اخبارات پر خام مواد	ہماری زبان، دہلی ۲۲/ اگست ۹۳ء ص ۲
شعار اللہ خاں	اردو صحافت کی گمنام تاریخ، نئی بازیافت	اخبار اردو، اسلام آباد نومبر ۹۳ء ص ۱۸
طاہر جاوید	تیسری دنیا، خوراک اور توانیئی کے وسائل	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۳ء ص ۱۱۲
عنایت اللہ نسیم پروفیسر حکیم	بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۳ء ص ۱۱
گربچن چندن	برصغیر میں اردو صحافت کی ابتداء	قومی زبان کراچی، نومبر ۹۳ء ص ۴۵
گلنار مردانی، پروفیسر	تیسری دنیا کا سیاسی استحکام	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۳ء ص ۹۳
محمد اسحاق بھٹی	میاں محمد شفیع	(م۔ ش) مشہور اخبار نویس، المعارف لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۶۳
محمد اسلم پرویز	سبز خون	تہذیب الاخلاق علی گڑھ جولائی ۹۳ء ص ۳۲
محمد سرفراز	اردو، ادب و صحافت میں انگریزی اصطلاحات	اخبار اردو اسلام آباد نومبر ۹۳ء ص ۱۶
ہنری لوہے	تیسری دنیا کی حالت زار	سائنس میگزین کراچی اگست ۹۳ء ص ۱۶۰

تعلیم تربیت مسائل و مباحث

آغا سہیل، ڈاکٹر	ہمارا ذریعہ تعلیم اور اردو	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۱۳
افضل علوی، پروفیسر	قومی یکجہتی کے لیے تعلیم کی اہمیت	اخبار اردو، اسلام آباد اگست ۹۳ء ص ۱۴
الطاف رسول	تعلیم یافتہ معاشرہ ہی معاشی خوشحالی کا ضامن ہے	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۳ء ص ۲۹
انکسار علی پاکستانی	بیرسٹر حسن عبدالرحمن ماہر تعلیم قانون	العلم، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۹۰
دیس راج سپرہ	ہریانہ میں اردو تعلیم کے مسائل اور ان کا حل	ہماری زبان، دہلی ۱۵ ستمبر ۹۳ء ص ۱
خورشید احمد	مستقبل کی تاریخ کو رنگ کون دے گا؟	تہذیب الاخلاق علی گڑھ ستمبر ۹۳ء ص ۲۶
خورشید احمد	اسلام کا نظریہ تعلیم	انشاء، کلکتہ اکتوبر نومبر ۹۳ء ص ۴
راس مسعود، سر	اپنی زبان میں تعلیم	سب رس، کراچی جولائی ۹۳ء ص ۵
ریاض الدین احمد (الہ آباد)	احمد رشید شیروانی اور ان کے نونہال------	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۳ء ص ۱۲
سید حامد، پروفیسر	مطلع اتنا غبار آلود بھی نہیں	تہذیب الاخلاق علی گڑھ جولائی ۹۳ء ص ۱۵
سید حامد پروفیسر	تعلیم اور تربیت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۳ء ص ۱۰
ضیاء الرحمن اعظمی	ہمارے بچے اور ان کی تربیت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۳ء ص ۴۲
عباس چغتائی	نپولین کا نظام تعلیم	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۳ء ص ۳۴
علی حسن	تین ماہ میں چار یونیورسٹیوں کا قیام	سب رس، کراچی اکتوبر ۹۳ء ص ۲۳

محمد اسحاق	گھر کا ماحول اور تعلیم	تہذیب الاخلاق علی گڑھ ستمبر ۹۳ء ص ۲۳
مسز پرویز عباسی	تعلیمی عمل میں والدین کی شمولیت	العلم، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۴۴
مصطفیٰ علی بریلوی	کراچی میں چار نئی یونیورسٹیوں کا قیام اور---	العلم، کراچی دسمبر ۹۳ء ص ۶
مظفر حسین غزالی	دینی مدارس کا طریقۂ تدریس	تہذیب الاخلاق علی گڑھ ستمبر ۹۳ء ص ۲۵
وحید قریشی ڈاکٹر	قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۲ء	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۹
وحیدہ نسیم، پروفیسر	تربیت و تعلیم کے میدان میں	سب رس، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۴

موسیقی، مصوری دیگر فنون

اختر علی خاں	کلاسیکی موسیقی، عالمی تناظر میں	تخلیق، لاہور اکتوبر ۹۳ء ص ۹۲
افتخار احمد	موسیقی اور موڈ	سائنس میگزین، کراچی اکتوبر نومبر ۹۳ء ص ۶۹
انیل دت اف س اعجاز	(انگریزی سے ترجمہ) تھیٹر اور نظریہ	انشاء، کلکتہ اگست ۹۳ء ص ۲۹
ایاز راشدی	فوٹو گرافی، ایک فن	ادبیات، اسلام آباد ۲۴-۶/۹۳ء ص ۲۵۹
عطش درانی، ڈاکٹر	ترجمہ اور اصطلاح سازی	اخبار اردو اسلام آباد نومبر ۹۳ء ص ۶
غلام رسول	رزم کی تلاش، فنِ مصوری	ادبیات، اسلام آباد ۲۵-۶/۹۳ء ص ۲۳۷
گلزار آفاقی	غلام رسول بحیثیت مصور	ادبیات، اسلام آباد ۲۵-۶/۹۳ء ص ۲۴۱
گلزار آفاقی	ایاز راشدی، ایک تخلیقی فوٹو گرافر	ادبیات، اسلام آباد ۲۴-۶/۹۳ء ص ۲۶۱
نسیم نیشوفوز، پروفیسر	سرئیل ازم، فنون لطیفہ کی ایک اہم تحریک	صریر، کراچی سالنامہ جولائی ۹۳ء ص ۱۰۷

علمی ادبی ثقافتی ادارے اور تحریکیں

آفتاب احمد خاں ٹ ڈاکٹر	حلقۂ اربابِ ذوق	اردو، کراچی اپریل جون ۹۲ء ص ۳۵
ادیب سہیل	مالک رام کی وفات پر انجمن ترقی اردو پاکستان---	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۳ء ص ۸۵
ادیب سہیل	پاپائے اردو کی یاد میں جلسہ اور قرآن خوانی---	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۷۹
ادیب سہیل	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں------	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۳ء ص ۸۴
اسلم قولسری	ایلٹس کالج عالمی اردو کانفرنس ۹۳ء کے مندوبین--	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۳ء ص ۸۵
اشفاق احمد اعظمی، ڈاکٹر	اردو سائنس بورڈ کی مجموعی کارکردگی ۶۲ تا ۹۳ء	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۳ء ص ۱۹
جلوب فرحان	اردو یونیورسٹی چند مسائل	ہماری زبان، دہلی یکم اکتوبر ۹۳ء ص ۱
سلطان احمد اصلاحی	اخوان الصفا کا ریاضیاتی فلسفہ	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۳ء ص ۷۱
سلطان احمد اصلاحی	ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسائل قسط (۲)	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جولائی ۹۳ء ص ۴۰
عبدالقوی دسنوی	ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسائل قسط (۳)	تہذیب الاخلاق علی گڑھ اگست ۹۳ء ص ۳۹
عبدالمتین	انجمن ترقی اردو ہند کی خدمات	ہماری زبان، دہلی ۲۲/اکتوبر ۹۳ء ص ۳
عطش درانی، ڈاکٹر	اردو یونیورسٹی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۳ء ص ۳۶
فردوسی، سید محمد احمد	مقتدرہ قومی زبان کی مجموعی کارکردگی،----	اخبار اردو، اسلام آباد اگست ۹۳ء ص ۶
	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مزید تعلیمی پیش رفت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۳ء ص ۵۳

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر — مشاعرہ ایک مقبول عام ثقافتی ادارہ — نگار، کراچی نومبر ۹۳ء ص ۲۰
محمد نصیر، پروفیسر — ارتقاء کی کہانی کچھ اپنی کچھ اس کی زبانی — ارتقا، ستمبر ۹۳ء ص ۱۷

مخطوطات و نوادرات

انیس ناگی، ڈاکٹر — پنجاب آرکائیوز کے بعض نوادر — اردو نامہ، لاہور اگست ۹۳ء ص ۲۵
سید حسن عباس، ڈاکٹر — آزاد بلگرامی کی تصنیف، غزلان الھند — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۵-۷۷/۹۲ء ص ۲۶۳
سید نعیم الدین، ڈاکٹر — داستانِ امیر حمزہ کا ایک قدیم نسخہ — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۵-۷۷/۹۲ء ص ۲۷
عبدالرب عرفان، ڈاکٹر — امیر خسرو کے چند غیر مطبوعہ مقطعات — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۵-۷۷/۹۲ء ص ۲۴۵
فرخ جلالی — فن تعمیر اور کتبہ شناسی پر ایک اہم کتاب کا---- — خدا بخش جرنل پٹنہ ۷۵-۷۷/۹۲ء ص ۲۷۶
وصی احمد بلگرامی — ملک خطا کے شہزادے — نگار، کراچی ستمبر ۹۳ء ص ۳-۸۶

قہرِ عشق

ولیم شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے انطنی کلوبطرہ کا منظوم ترجمہ

اشاعت ثانی

شان الحق حقی

قیمت =/۱۲۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

غالب آشفتہ نوا

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں

قیمت: =/۵۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی

حروفِ تازہ

رباعیاتِ سرمد

۱۹۹۴ء

ترجمہ سلیم الرحمٰن
صفحات ۱۹۵ قیمت =/۱۲۰ روپے
بک مارک (پرائیوٹ) لمیٹڈ
پاک چیمبرز ۵- ٹمپل روڈ، لاہور

دلّی دور نہیں

۱۹۹۴ء

ڈاکٹر انور سدید
صفحات ۳۰۸ قیمت =/۱۵۰ روپے
مقبول اکیڈمی، شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور

دُھند میں سائے

۱۹۹۴ء

پروفیسر سعیدہ اختر
صفحات ۲۲۴ قیمت =/۱۲۰ روپے
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ ۲۵ لائر مال لاہور

لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات

۱۹۹۳ء

ڈاکٹر گوہر نوشاہی
صفحات ۳۳۵ قیمت =/۳۰ روپے
مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور

دُکھتی رگیں

۱۹۹۴ء

انیتا غلام علی
صفحات ۸۰ قیمت =/۳۰ روپے
کفایت اکیڈمی، شاہراہ لیاقت
نزد فریر مارکیٹ- کراچی

دیوان عمگین

۱۹۹۴ء

عبدالقادر عمگین رام پوری
صفحات ۵۲۰ قیمت =/۲۰۰ روپے
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

اقبال اور معاصر ادبی تحریکیں

۱۹۹۴ء

خالد اقبال یاسر
صفحات ۲۴۸ قیمت =/۱۰۰ روپے
اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور

علامہ اقبال اور عرض حال

۱۹۹۴ء

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی
صفحات ۹۶ قیمت =/۴۰ روپے
اقبال اکیڈمی لاہور

پطرس کے نثری افکار

۱۹۹۴ء

مرتبہ شیما مجید
صفحات ۳۵۲ قیمت =/۱۵۰ روپے
الحمد پبلی کیشنز۔ رانا چیمبرز
سیکنڈ فلور، لیک روڈ، لاہور

شہاب بیتی

۱۹۹۴ء

شہاب الدین رحمت اللہ
صفحات ۴۴۸ قیمت =/۳۰۰ روپے
پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۲۲۹۳ کراچی

تاب سخن

۱۹۹۴ء

محمد رضا کاظمی
صفحات ۲۴۸ قیمت =/۱۵۰ روپے
مکتبۂ ادب۔ ۱۴۲ زُہرا نگر۔ گلزارِ ہجری کراچی

آپریشن صومالیہ

۱۹۹۴ء

رفیق ڈوگر
صفحات ۱۷۷ قیمت =/۱۴۰ روپے
۲۳ فضل منزل. بیڈن روڈ لاہور

غالب اور مطالعۂ غالب

۱۹۹۴ء

ڈاکٹر عبادت بریلوی
صفحات ۵۰۵ قیمت =/۳۰۰ روپے
ادارۂ ادب و تنقید۔ لاہور

پیاسی زمین کا دوسرا ایڈیشن

۱۹۹۴ء

احمد ہمدانی
صفحات ۱۱۰ قیمت =/۸۰ روپے
سیپ پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۴۲۲ کراچی

شیر دریا

۱۹۹۴ء

رضا علی عابدی
صفحات ۳۴۱ قیمت =/۱۵۰ روپے
سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

تنقید کی آزادی

۱۹۹۴ء

مظفر علی سیّد
صفحات ۳۴۰ قیمت =/۱۸۰ روپے
دستاویز مطبوعات کوٹھی رتن چند (رتن باغ)
میو ہسپتال۔ لاہور

فراق گورکھپوری شخصیت و فن

۱۹۹۳ء

ڈاکٹر نوازش علی
صفحات ۷۲۸ قیمت =/۳۵۰
دستاویز مطبوعات۔ کوٹھی رتن چند (رتن باغ)
میو ہسپتال۔ لاہور

Regd M. No. 270

Phone: 461406

Monthly

QAUMI ZABAN

Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

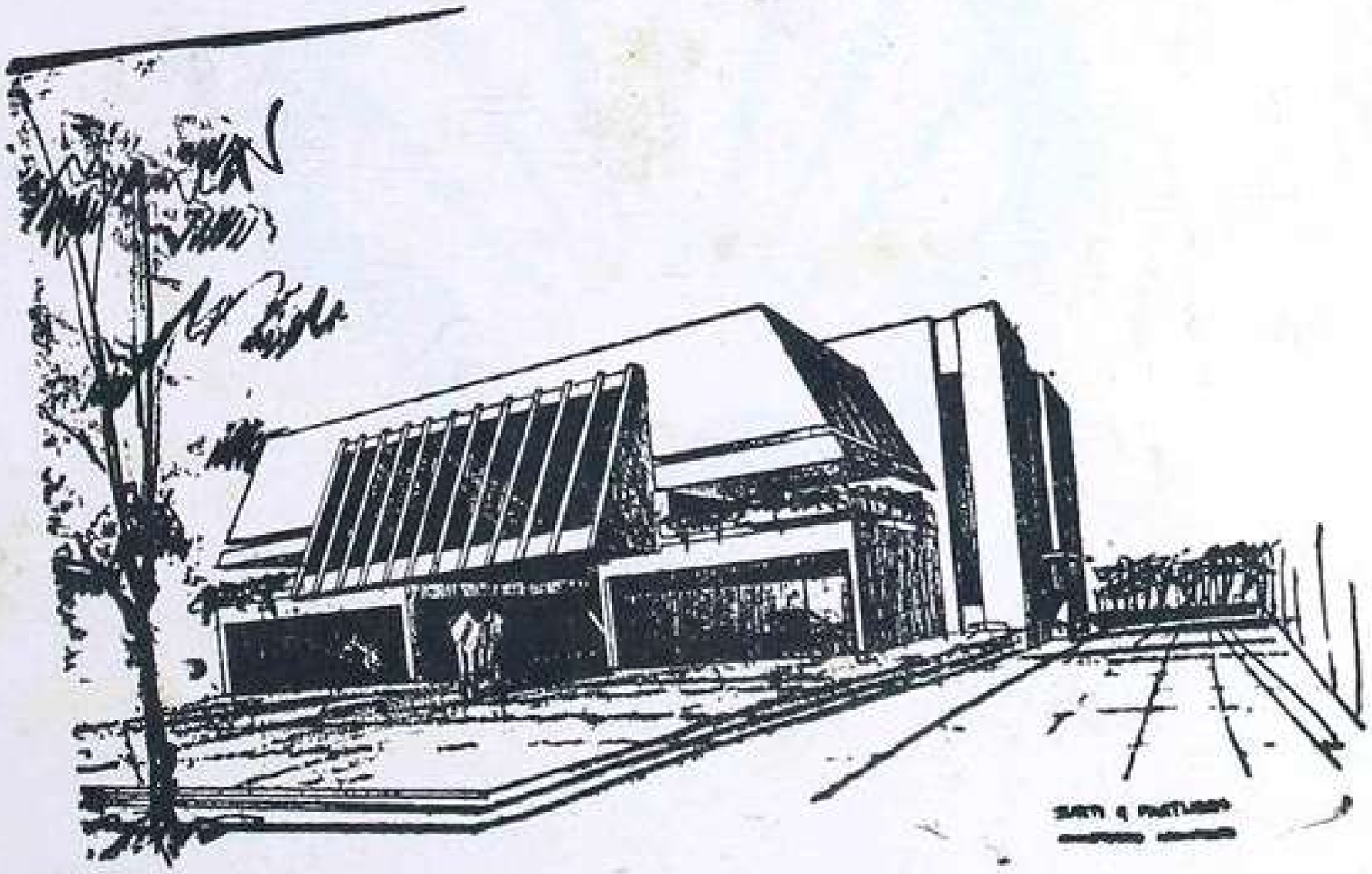

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: فضلی اینڈ سنز کراچی مقام اشاعت ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی